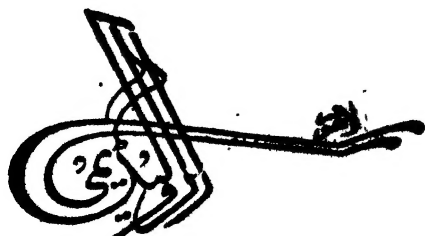




گنجائے اگر انداز











# گنجائے کراچی

از

رشید احمد صدیقی

صدا

شعبہ ادارہ قلم و پیرہن، لاہور

۱۹۶۰

کیتھمن

ارو

صدر انارک، ڈیو، حیدر آباد، دکن

جُملہ حقوق محفوظ

باردو تم ۴۴ قیمت علی

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لیم  
تو نے وہ گنجائے اگر انسایہ کیا کئے

غلبا

۹۲۰۰۵۴

۵۵۵

# فہرس

نمبر	عنوان	صفحہ
۱	محمد علی رحم	۷
۲	ڈاکٹر انصاری مرحوم	۱۱
۳	میرے مولینا	۱۹
۴	مولینا ابوبکر مرحوم	۵۹
۵	مرحوم اصغر گوندوی	۹۵
۶	الیوب	۱۱۹
۷	سراقبال مرحوم	۱۳۷
۸	احسن ماسہروی مرحوم	۱۵۳



محمد علی  
تفصیل  
۱۹۵۹  
۶۷۳۷

ولادت تو ماورِ زاد ہوتی ہے لیکن محمد علی کی موت خانہ زاد تھی۔ عام طور پر موت اپنا  
انتخاب خود کرتی ہے لیکن محمد علی نے خود موت کا انتخاب کیا اور یہی وہ چیز ہے جس نے محمد علی کی  
زندگی اور موت دونوں کو ایک حقیقت بنا دیا۔ ————— سنگین اور صالح!  
محمد علی کی زندگی اور موت دونوں ان کی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری تھی۔  
اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے۔ ————— صحیح اور گرانمایہ!

محمد علی کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز تھے کس کی زندگی میں نہیں ہوتے لیکن ان کی  
موت نے ہر نشیب کو فراز اور ہر فراز کو پُر شوکت بنا دیا۔



محمد علی کو بدلتے قول اور بدلتا قول سے سابقہ پڑا، ایسے بدلتے قول اور بدلتا قول جو کبھی کے  
تھے ہوا موس اور اکثر کینہ پرورد بھی۔ محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی  
میں نہیں بلکہ اپنی موت سے!

✓ محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ بیگانوں  
اور ٹنک نظروں کا فیصلہ ہے۔ مروغازی، کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت والی غنیمت  
کی فراوانی، جن جن جلیس کی ہم بھی طرح انگیزی، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا  
بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے، ٹوٹی ہوئی تلوار، بھری ہوئی زرہ، بننے ہوئے لہو، کچلتی ہوئی رُوح،  
اور دھکتے ہوئے چہرہ ————— ڈوبتے ہوئے سورج سے! ر

محمد علی کا قلب عزم تھا لیکن روح امر ربی۔ بشارت انلی بھی عزیمتوں کہ جن کو وہ  
محبوب رکھتے تھے وہ بھی ان کے مخالف تھے۔ کیسی مخالفت اصولی نہیں بلکہ اکثر ذاتی مفاد،  
نفس پروری اور تن آسانی کے تحفظ کے لئے وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے  
نہیں بلکہ دھڑی اور بھڑیلوں سے سابقہ ہو۔ بشارت انلی اس لئے کہ شخصیت کا سیلاب رہی۔  
شخص کا انجام ناقابل التفات۔ افراد کی ناکامی، حق کی کامیابی کی دلیل بنے۔ — روشن  
اور محکم!

محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی۔ وہ تیغ اکیل تھی جو دم میں بے پناہ تھی اور  
بزم میں ایک سلوہ گری۔

وہ مخالفت اور مقابلہ میں بے باک اور بے پناہ تھے۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے ان کو پناہ دیتے تھے۔ ان کی دل دہی اور دل آسائی کرتے۔ ان کے لئے مارنے مرنے پر تیار رہتے محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی۔ ان سے مدد لینے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری، ساری فداکرت و ہلاکت محمد علی کی اور کامیابی یا شہرت مدد لینے والے کی !  
وہ آخریش مادرِ بازو تھے برادر اور دوست عزیز ال تھے !

کس بلا کے بولنے اور لکھنے والے تھے۔ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالمول کی آواز نہ مرم مصری سے ٹپرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توہیں مٹھلنے والی ہیں۔  
یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔ میں نے ان کو اسٹیج پر آتے اور بیٹھتے ہوئے سنا ہے اور خود محمد علی کو داد دینے سے پہلے انہیں کو داد دی ہے۔  
ضمیمہ ڈکارتا ہوا دکھلا کھپا رہے !

محمد علی پر روپیہ اور شہرت کی بارش ہوتی اور محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب بنا کر بہا دیا۔ دونوں نے مفارقت کی۔ بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جان کی تھیں۔ ان کی روح پاک تھی۔ غائب کیا معلوم نہ رہتے تو کیا ہوتا۔ بولتے تو فوراً اور سرسلیحہ مال کو کیساں سمجھنے والی کی موت آخر کیا شہادت دیتی ہے !

محمد علی کی موت کا سال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے یقین میں آیا اور رہ رہ کر یقیناً اتار ہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طوفان پر کیا۔ — خود موت پر کیا گزری ہوگی۔

پھر سوچنے لگا کہ اگر محمد علی کی بجائے قضا و قدر یہ پارہ کار پیش کرتے کہ اچھا محمد علی کی بجائے  
ہندوستان کے کسی مسلمان لیڈر کو حوالہ کرو۔ یہ سوال آتے ہی خدا جل نے فیصلہ دل میں کیسے آیا۔  
اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہ محمد علی کے بدلہ میں ہندوستان کا بیڑے سے بڑا لیڈر دیا جاسکتا  
تھا اور اس کا ماتم نسبتاً کم ہوتا۔

لوگ آزدہ نہ ہوں، انسان کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے ہیں انہیں خیالات  
کو کبھی الما قرار دیا جاتا ہے اور کبھی یہ صرف عمل بھی ہوتے ہیں لیکن خیال کے عجیب ترمیموں کی  
معنی ہمیشہ عمل یا عمل نہ ہونے کے تو نہیں ہیں۔  
محمد علی میں کمزوریاں بھی تھیں لیکن کمزوریاں نہ ہوتیں تو آج کل کے مسلمان لیڈر معطلے کمال،  
اور برطانوی شہنشاہیت پر کیا گزر جاتی۔

---

ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرہ جنگ خاموش ہے۔ فتح و شکست تو اسی  
لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح و شکست ہوتی رہے لیکن جنگوں کماں ہے ہشماوت کس کو نصیب  
ہوگی، ایسا حسین کماں جس کی خود برباد کو تلاش ہو یا

---

آئیے جہاں کل فاتح بیت المقدس نے سر جھکایا تھا وہاں آج محمد علی کی معراج منائیں!!

# ڈاکٹر انصاری مرحوم

سرخاک شہید سے برگزائے لالہ می پاشم

ڈاکٹر انصاری موجود تھے اور کسی کے مرنے کی خبر سننے میں آتی تھی تو سوال فوراً زبان پر آتا تھا  
ڈاکٹر انصاری کو بھی دکھایا تھا؟ اب جب کہ ڈاکٹر انصاری کی رحلت کی خبر آتی تو مختصری دیر تک غفل و  
حواس معطل رہتے، سوچنے لگا آخر ڈاکٹر انصاری کیونکر جہاں بحق ہوئے اور یہ کیونکر ممکن ہوا کہ وہ خود  
اپنے لئے اس موت کا سد باب نہ کر سکے جس کو ان کی نتھری، جھکیلی، گہری اور مرض اور تندرست  
دونوں کو تسکین دینے والی آنکھیں ہمیشہ روک دیتی تھیں مثال دیتی تھیں اور یہ کادیتی تھیں۔  
میں ہمیشہ مرض رہا اور ڈاکٹر انصاری سے اپنی تکلیف رجوع کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ میرا  
مرض معمولی مرض نہیں ہے اور اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب ذہن کی انصاف  
ایسی مٹیالی، نناک اور غلیظ ہو جاتی جس کو میں اس طرح چھو سکتا تھا جیسے گلی سڑھی چھو تیدی

کو اس وقت میں اُن کے مطلب کا رخ کرتا۔ انتظار میں اکثر زیادہ وقت صرف ہوتا اور میں اُن کے انتظار کے کمرہ میں لٹٹھا، فنجوری کی دکانوں، گزیرنے والوں کی تنگ دودھ گاڑیوں اور پھیری والوں کے شور و غیب دیکھتا اور سوچتا کہ یہ چل پھل، یہ لہر بہر، میٹھنولیت، پیمیشا، زندگیاں جیسے جس سے میں ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دیا جاؤں گا، زندگی ہی وہ کل ہے جو اپنے جزو سے منفی ہے تو مجھ پر ہراس، مایوسی اور اکثر بغاوت کا ہند بٹاری ہو جاتا۔ اور میں زیادہ پتیا کی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہو جاتا۔

اتنے میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر آتی، وہ اپنے مضبوط اور مہوار قدموں سے درجہ پر چڑھتے اور کسی عہداری سے گفتگو کرتے ہوئے سنائی دینے، دیکھتے ہی مسکراتے اور اس طرح کہ گھنی پلکیوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں بھی مسکرا سکتی تھیں، کہتے تھے جی تم کہاں بڑے عرصہ تک غائب رہے ہیں کتنا ڈاکٹر صاحب بڑی تکلیف ہوئے پریشان ہوں کچھ کرتے کرتے صبر نہیں بنتا۔ بولتے گھبراہٹ میں ابھی دیکھتا ہوں، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ باتیں اس لب و لہجہ سے اور اس طرح ہنس ہنس کر اعماد اور عقائد، دل آسانی اور دلربائی کے ساتھ دیتی اور ہنر نگاری کی شان سے کہتے کہ مجھے خود محسوس ہونے لگا کہ میں ناحق پریشان ہوا۔ اس سے پہلے کیوں نہیں آیا۔ خواہ مخواہ اتنے دنوں مصیبت و مایوسی میں کیوں مبتلا رہا۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا اس سے بات کرتے سجتے، انہماک گفتگو سے محسوس ہوتا کہ وہ دوسرے سے بات اس لئے کر رہے ہیں کہ مجھے تقویت پہنچے اور مجھ سے گفتگو کرتے تو اوروں کو محسوس ہوتا کہ وہ دوسروں میں بھی اعماد و اوستید کی روح پیدا کر رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ صرف مریض یا اُن کے اعوانہ ہوتے بلکہ مختلف اقسام کے لوگ ہوتے مقاصد کی نوعیت بھی بدل گاتے ہوتی، لیکن ڈاکٹر انصاری کی بات میں وہ عباد و نفا کہ ہر شخص

یہی سمجھتا کہ گڑا کٹر انصاری مخاطب دوسروں سے ہیں لیکن کہہ رہی رہے ہیں جو ہماری تقویت یا دل چسپی کا موجب ہو۔

ڈاکٹر انصاری اپنے معائنہ کے کمر میں لے جاتے، مجھے اس قسم کے معائنہ خانوں اور پریسین وغیرہ میں جانے کا اکثر اتفاق ہوتا ہے لیکن جس امید اور اعتماد کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر بھٹی (کھنٹو) کے حوالہ کیا ہے وہ مجھے کہیں اور نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر انصاری اس طرح دیکھتے، ٹوٹتے گویا وہ خود اپنے جسم یا دورہ کو ٹٹول رہے ہیں۔ ان کی انگلیاں، خوبصورت، سڈول، گداز پاکیزہ خوش رنگ اور ایسی محتدل حرارت کی ہوتیں اور ان کو وہ اس نرمی اور نزاکت کے ساتھ کام میں لاتے کہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کی انگلیاں میرے جسم کو چھو رہی ہیں۔ آہ ان کی گھنی ابرویں اور لمبی پلکوں والی، گہری، روشن اور ہلکتی ہوئی آنکھیں اور شیر و شمس کی نگاہیں جو جسم و جان میں اس طور پر نفوذ کرتیں جیسے کوئی تھپا خیال یا اچھا کام قلب کو بالیدہ ہدایت کو رنگین اور خیالات کو بلند کر دیتا ہے وہ مریش کا ساتھ ایسے کرتے جیسے وہ ان کا جان چھڑکنے والا بھاتی چہنٹا بیٹا یا ماں نثار دوست ہے۔ ان کی پیشانی ایک روشن و صاف تھپی جس میں مریش کو امید اور برائے والی اُبلد کے لغزش نظر آتے تھے۔ معائنہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا گویا ڈاکٹر انصاری کو آج تمام دن کوئی اور کام کرنا نہیں ہے اور اسی مریش پر تمام وقت اور توجہ صرف کریں گے۔ معائنہ ختم کرنے کے بعد میز پر لیٹے ہوئے مریش کو خود مہملا دے کر اٹھانے۔ کچھ دیر تک اسے میسر پر پاؤں اٹھاتے ہوئے بیٹھا رہنے دیتے اور خود اس کے پاس کھڑے ہو کر اس طور پر باتیں کرتے جیسے اپنے کسی گھر کے بے تکلف دوست سے خوش گپیں کر رہے ہوں۔ اس کے بعد، ماں سے کہہ کر میرے اتارنے کے چھوٹے بہن۔ نے میں مدد دیتے، دیکھ لکھتے، استعمال کی ترکیب بتاتے اور

خصمت کر دیتے۔

ڈاکٹر انصاری سے رخصت ہو کر میں اپنے آپ کو بالکل تندرست سمجھنے لگتا۔ اگر مرض کی کچھ تکلیف بھی ہوتی تو سمجھتا کہ دوا استعمال کرنے کے بعد ہی جاتی رہے گی۔ چنانچہ میں طبیب اترتے ہی فوری اور چاندنی چوک کی ہل ہل اور نم مٹی میں گم چوبھاتا۔ ہل والوں کے ہاں سے ہل خریدتا اور کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتا اور مدقول پر میر کرتے کرتے کھانے پینے کا ہر لطف کھو چکا ہوتا اس کو بد پرہیزی سے اندر لے کر داخل کرتا۔ دل کا اندوہ بھٹ جاتا اور زندگی خوشگوار اور خوش آئند معلوم ہونے لگتی میں نے ایک بار ڈاکٹر انصاری کو سر ہری کرتے بھی دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ماہر معتمد کے ہاتھ میں موطم رہنے یا کوئی مریض ساز کسی نادرک زبیر یا مشین پر کام کر رہا ہے۔ نشتراں کی انگلیوں میں اس طوط پر کام کرتا جیسے ہزاروں اپنے قلم سے خطوط کھینچ رہا ہے۔ نزاکت اور مصلابت و دہلی کا مزاج، ایسا مزاج جو قوس قزح کے رنگوں میں پایا جاتا ہے، چہرہ پر سخیگی، آنکھوں میں گہرائی، انگلیوں میں صفائی اور تیزی۔ آپریشن میں آلودگی کا ہونا لازمی ہے لیکن ڈاکٹر انصاری کو آپریشن کرتے دیکھتے تو معلوم ہوتا جیسے خلیں کا ماہر مختلف ٹکڑوں کو جو اسکرول سے جڑے ہوں، نو بی پھرتی صفائی اور اعتماد کے ساتھ مل جل کر رہا ہے۔

مدین گندری میری طفولیت اور اللہ اللہ کے شباب کا زمانہ تھا۔ اللہ اللہ کے بچنے پرچے آتے تھے ہم لوگ اس کو مشوق اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔ جہارت سمجھتے تو فکر کرتے اور وہاں نہیں سمجھتے تھے وہاں یخیل کرتے تھے کہ کوئی بڑی بلندیا گری بات کسی ہے جو ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے اس کا احترام اور زیادہ کرتے تھے۔ کھلی بار گھر گیا بچپن کی الماری گرد و غبار سے اٹی پڑی ہوتی تھی۔ ایک پرانے لفظ نظر جا پڑی۔ دیکھا تو اس دند کی تصویر تھی جو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سر کردگی

میں یہاں سے جنگ بھقلان میں زخموں کی مرہم پٹی کے لئے گیا تھا۔ یہ تصویر اس زمانہ میں اسد اللہ  
میں شائع ہوئی تھی نیچے لکھا ہوا تھا۔

”اے وہ لوگو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو جب وہاں پہنچا تو خدا را ان کے زخموں  
پر سختی نہ کرنا کیونکہ وہ زخمیں ان کے نہیں ہیں بلکہ اسلام کے ہیں۔“

آہ وہ زمانہ یاد آ گیا جب ابوالکلام، محمد علی، ڈاکٹر انصاری کو ہم سب خدا جانے کیا سمجھتے  
تھے معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام پتھر سو برس نہیں گزرتے ہیں۔ بڑے ہو کر ہم بھی  
ہندوستان سے باہر کربا مسلمان مجاہد کی طرح لڑیں گے، زخمی ہوں گے شہادت پائیں گے فاتح  
کہلاؤں گے۔ دنیا دیکھے گی کہ اسلام اور اسلامیوں سے بڑھ کر کوئی نعمت اور منزلت نہیں ہے۔  
آج جب کہ یہ طور لکھ رہا ہوں ماضی کا قبلہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور تصور کی کرنیں  
طفولیت کے اس افق پر پڑ رہی ہیں جہاں ہم رہ رہ کر تکرار کرتے تھے کہ کیوں ہمیں کازمانہ نہیں ستم ہوتا۔  
اس ستم ترکوں کی مدد کے لئے۔ اسلام کا نام روشن کرنے کے لئے، زخمی ہونے کے لئے سپاہیوں  
کی صف میں کھڑے ہونے کے لئے کیوں نہیں بلائے جاتے۔ لیکن اب کیا حل ہے، ہم بدل گئے  
زمانہ بدل گیا، دنیا بدل گئی، سبج و راحت، عزت و ذلت کا تصور بدل گیا۔ زندگی کی حدود بد  
ہے لیکن حدود کا لطف باقی نہیں رہا۔ تقصورات میں نہ زنجین باقی رہی نہ حرارت ہوا تم میں نہ  
استوار رہی ہے اور نہ برکت امان موجودہ حمد کے مسائل اور طائبات کچھ اور ہی ہیں فرائض اور  
ذمہ داریاں بھی بدلی ہوئی ہیں لیکن خدا کوئی یہ بتاتے یہ کیسے مسائل ہیں یہ کیسے فرائض ہیں جن سے  
دماغ میں روشنی نہیں پیدا ہوتی دلوں میں دلوں نہیں پیدا ہوتے، ہاتھوں میں قوت نہیں پیدا  
ہوتی اور نہ زندگی سے حرارت مفقود ہو چکی ہے۔

ظاہر ہے میں پُراندہ قوتوں کا ہوں راکتی بے وقت کی ہے زمانہ ترقی کی کچا ہے، زندگی اور



زندگی کے تار و پود نئے اسلوب سے مرتب ہو رہے ہیں۔ ہر چیز کی قدر و قیمت گھٹ بڑھ رہی ہے۔ جس چیز کو ہم تاحیہ یعنی سمجھتے تھے وہ متاع کا سد سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور جسے اب دیکھ کر ہم غفل اور سراپہ ہوتے ہیں وہی حاصل حیات ہے۔ زمانہ اور زندگی کی رفتار یہ نہیں اس کا رخ بھی بدل گیا ہے لیکن زندگی کی بہتری کو حقائق کا انکشاف کیوں کہتے۔ سائنس کے کوششوں کو کونسا کام مجبور کیوں بتایا جاتا ہے۔ آرٹ اور انسانی کی قربان گاہ پر کن چیزوں کی کھینٹ چڑھانی سارے افراد کی شادی دہلی کیا ہوگی، ان کی پروا کیوں نہیں کی جاتی۔ جماعت کے ریگنار سے افراد کی امید اور امنگ کے مختلف تان کیوں فنا کئے جا رہے ہیں۔ یہ سب بے وقت کی راگنی صحیح رنج و راحت کا تصور افسوسہ بھی درست لیکن رنج و راحت کا احساس کیونکر بدل گیا؟

طاہر انصاری، ہندو مسلمانوں کے نفاق و افتراق کو دور کرنے کی فکر میں ایم اے کرکٹ میں رہے۔ وہ نفاق و افتراق کو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مرض سمجھتے تھے اور اب سچے طبیب اور ڈاکٹر کی مانند بعض سے ہمدردی کرنے اور مرض کے ازالہ میں پوری توجہ اور دوسوزی اور قابضیت صرف کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندو مسلم اختلاف کو مندریاسلم کی حثیت سے دیکھی رکھی اور اس کی چارہ سازی کی۔ انہوں نے اس مرض کے ازالہ کی ایک حقیقی طبیب کی حقیقت سے کوشش کی۔ واکر انصاری کے علاوہ اس کے علاوہ اور چارہ کاری نہ تھا۔ وہ جب کرتے بدیا کچھ کرتے اور معتدنا کرتے طبیب طاہر کی حثیت سے کرتے اور ایسا ہی انہوں نے کیا۔

ہندو زعماری کی ان بات سے لکھنے والے کہ کیا ان تقیم ہو گئیں۔ بیرونی لاوارث گزشتہ۔  
نوجوان نے دست و پا سوئے۔ رفتاری پیوٹھے۔ وہ حلو نہیں کن کن مراتب پر کیسے کیسے گراں

کی مدد کر چکے تھے اس بڑے پختے کی گردش سے کتنی چھوٹی چھوٹی اور مختلف متفرق شینیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ مختاروں ہی کے مددگار نہ تھے بلکہ ان لوگوں کی تان بان اور مصلحتی کے بھکے کیفیل تھے۔ جن کو آس پاس کے گردش ایام "برابری جاتی تھی۔ ایسوں کی دستگیری معمولی کام نہ تھا۔ نہ اثر، اقتدار کا کتنا بڑا حصہ ان پر صرف ہونا ہو گا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے ہر قسم کی مدد، انتہائی کشادہ قلبی اور دیادلی کے ساتھ دوسروں کی کی ہوئی۔ اور شاید کوئی ایسا نہ ہو جس سے اپنی نوعیت کی مدد و اکڑ انصاری نے حاصل کی ہو۔

انہوں نے خوب کیا، خوب صرف کیا، ان پر ایسے ایسے مواقع بھی آتے جب ان کے پاس کھانے اور صرف کرنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں کسی ایسے کے جس کے کیفیل ڈاکٹر انصاری تھے کبھی کسی ایسے موقع سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ جب اس کو کھانا اور خرچ کرنے کی سختی بھیلینی پڑی ہو۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم نہ تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے رفقا اس سے کوئی ایسا نہ ہو گا جس نے ڈاکٹر انصاری کی اتنی مدد کی ہو جتنی ڈاکٹر انصاری نے اس کی کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ لوگ جن پر ڈاکٹر کے احسانات تھے ڈاکٹر کے لئے کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسی سے ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان اکثر و بیشتر صرف یہ کہتے ہیں کہ مدد لینے میں تلخ ناچی کی بھی تیز اٹھا دیتے ہیں لیکن مدد دینے کے وقت اس حالت کو بیکر فراموش کر جاتے ہیں۔ جب خود ہم کہ مدد مانگنے کی ضرورت ہوتی تھی اور ہماری مدد کی گئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری باجمہ ملیہ کے قیام و ترقی میں جو کچھ کرتے رہے اور ان کی جوائنڈی اور دوسرے اس سے وابستہ تھے اس کا انکار نہیں کر سکتے ہوں۔ غالباً چند ہی لوگ ایسے ہوں گے جو کچھ سے زیادہ اس کا احساس کر سکتے ہوں۔ ابھی ابھی رمضان کی ایک شام کہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ

علیہ ڈاکٹر واکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ

جاسوہ کی نئی عمارت دیکھنے کو کھلے گیا ہوا تھا۔ اوکھلے کے صاف سادے درق پر ایک نقش  
 اُبھرا ہوا تھا۔ بدیع اور بلند عمارت کا نقشہ اور اس کا سپکرا بھی نامکمل تھا۔ تصور تصویر پر منتقل  
 ہو رہا تھا۔ مستقبل کا افق دھیرے دھیرے ان تمام گہرائیوں اور پناہوں کے ساتھ بے نقاب ہو رہا  
 تھا جن میں یون کا عزم پرورش پاتا ہے، بالیدہ ہوتا ہے اور آفاق پر چھایا جاتا ہے۔  
 عمارت کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک طرف ڈاکٹر انصاری آسودہ خاک تھے اور عدنان کے  
 بہشتی جھوکے سے اپنے حسرات کی زردیوں تعمیر ہو رہے دیکھ رہے تھے۔  
 دیر ہو رہی تھی، ہم سب واپس آ گئے

---

# میرے مولینا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی  
دوانا مر گیا آخر کو دیرانے پر کیا گزری

مولانا سلیمان اشرف صاحب اس بہان سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام  
باتیں لے گئے۔ جو میرے لئے اب کسی اور میں نہیں۔ میرا ان کا خون کا کوئی رشتہ نہ تھا صرف  
علی گڑھ کا رشتہ تھا لیکن کس سے کسوں اور کون مجھے گا کہ اس رشتہ میں کیا تھا اور کیا نہ تھا۔  
وہ میرے لئے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے۔ بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست۔  
پریشیاں ہوتا تو ان کے ہاں جاتا۔ جی گھبراتا تو وہاں جاتا۔ خوش ہوتا تو وہاں ضرور جاتا۔  
اور جب کہیں نہ جانا ہوتا تو وہاں جاتا۔ گھنٹوں بیٹھتا۔ کوئی معمولی جان پہچان یا تعلقات کا آدمی

پہلے سے موجود ہوتا۔ تو اسے رخصت کر دیتے۔ کوئی اچھا ملنے جلنے والا موجود ہوتا تو اسے اٹھنے نہ دیتے۔ جو کچھ ہوتا اس سے ضرور تواضع کرتے۔ ایسا کبھی نہ ہوا کہ کوئی چیز موجود نہ ہو مجھے چاہتے کاشوق نہیں مرحوم اس کے بڑے سٹائق تھے اور بڑے تکلف سے ملتے۔ اصرار سے ایک پیالی دیتے۔ کہتے پی لو۔ پھر گپ ہوگی۔ ایک پال کھاؤ۔ دوسرا مجھے بنا کر دو۔

میں کتنا آپ کے ہاں چاہتے میں نہ شک نہ دودھ۔ فرد کیسی ہوگی؟ کہتے میرے لئے پیٹے ہو یا اپنے لئے۔ میں نے دبی زبان سے کہا بیوی بچوں کا بھی تو خیال ہے۔ فرمایا کبھی بھی بیوی بچوں سے الگ رہ کر بھی زندہ رہ لیا کرو۔ میں کتنا آپ رام پوری تبا کو کھانے میں۔ یہ میرے بس کی نہیں ہے۔ کہتے چاہتے میں دودھ شکر اور پال میں خوشبودار تبا کو کھاتے ہو۔ نشہ کا احترام کرنا نہیں آیا۔ آواز دیتے تھا! رشید کی پیالی میں شکر ڈالنا، پھر پارتے گچھن" رشید کو تبا کو دو۔ بڑی مزیدار معطر تبا کو ہوتی۔

پھر گنگو کا سلسلہ شروع کرتے۔ آج تک یہ نہ پوچھا کیسے ہو، بال بچے کیسے ہیں کیا کرتے ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو میں خود ہی کہتا یا انہیں پہلے سے معلوم ہوتی۔ کبھی انہوں نے مجھے گھر سے بلوا نہ بھیجا۔ کبھی ہی ضروری بات کیوں نہ ہوتی اس کے منتظر رہتے کہ جلتے چمکتے ملاقات ہو جائے گی۔ تو کہہ دیں گے۔ ایسا موقع ہوتا تو صرف چند منٹوں میں بات ختم کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے اچھا براؤ۔

مجھے خوب یاد ہے ایک دن میں دو منزلیں کے سامنے سے بڑی تیزی سے سائیکل سے گزر رہا تھا۔ سامنے چوڑے پر پٹل رہے تھے، فوراً پکارا ڈالٹھنٹا، میں رکھا سائیکل کو چوڑے سے لگا کر قریب آنا چاہتا تھا، فرمایا نہیں نیچے ہی کھڑے رہو، ایک بات کہنی تھی، وہ متا ریا ر۔ اصغر دشا اب کے الہ آباد کے سفر میں ساتھ ہو گیا تھا کیا شعر کہا ہے۔

دردِ جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بن جائے  
جس جگہ بٹھکے پی لیں وہی میخانہ بنے

اس شعر کو اپنے خاص ترنم کسی نذرِ حزنِ لیکن پُر وقارِ لہجہ میں پھر ٹپھا کہنے لگے، رشید  
اس شعر کا کہنے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ الہ آباد تک ساتھ رہا بڑا کڑھامو آدمی ہے  
اب کبھی باتیں تو ضرور لانا۔ اس شعر کی خوبی کی تفصیل پھر کبھی سنائوں گا۔ اس وقت جاف خوش ہو  
مرحوم کے ہاں جیسے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کے لئے مخصوص نہ ہوتا، باتوں ہی باتوں  
میں ایسے ایسے فقرے اور لطیفے کہہ جاتے کہ طبیعتِ باغِ باغ ہو جاتی۔ ہر بات بے مضطربان  
کہتے بے مضطربان، انہیں کا فقرہ ہے، کبھی کبھی ایسے الفاظ اور فقرے بھی کہہ جاتے جو ثلث  
کی زبان پر نہیں آتے لیکن اس بے ساختگی سے اور اتنا جرئت کہتے کہ اس لفظ کی ثلث کی طرف  
ذہن منتقل نہ ہوتا۔ ان کی باتوں میں سلاوت تھی، کبھی کبھی خاص بہار کا کوئی لفظ بول جاتے  
اور کہہ دیتے کہ یہ خاص بہار سے دیا رکال لفظ ہے۔ ایسا جامع لفظ اور کہیں نہ ملے گا۔

گرمی ہو موندو موندو، صوفاء، محنت ہو بیٹھتے ایک ہی وضع سے تھے۔ پاؤں اٹھا کر  
اور سمیٹ کر۔ اسی طرح بیٹھ کر چائے پیتے، مطالعہ کرتے، لکھتے اور باتیں کرتے نشست کا  
ہر طرح کا سامان ہوتا۔ چوتھے سے متصل نیم دائرہ سا تان میں موندو موندو بچھے ہوتے، ایک  
طرف چارپائی بھی ہوتی۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا اس کے لئے کوئی کچھ گرمی  
یا صوفاء وغیرہ اندر سے نہ نکالا جاتا۔ جو موجود ہوتا اسی پر وہ بھی بیٹھ جاتا اور سارے مجمع کو دیکھ  
کہ یہی محلوں ہوتا کہ مرحوم ہی سب پر بچھائے ہوتے ہیں۔ کسی سے آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو  
نہ کی جس سے محلوں ہوتا کہ مولیٰ بنا نو وارو سے مراد ہیں یا اس سے خاص طور پر محفط ہیں۔  
بڑے سے بڑے نواب کو کبھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھ دیکھا ہے اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن

مولانا ہر ایک سے ایک اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ مولینا کا پڑانا تو کربا اسی طرح قلوبِ معلّٰی کو چاتے کی ایک پیالی لا کر دے گا۔ جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا وہی بے مضبوط زبان گفتگو وہی نشست، وہی فضا، جس کا سبب چاہا اُٹھ کر بیٹا گیا۔ اسی دوران میں محزون وار بھی تشریف لے گئے، اور مولینا مرحوم اپنی جگہ پر جوں کے توں باغ و بہار یا کوہِ قاف رہے بیٹھے رہے!

زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے لیکن اکثر محسوس ہی ہوتا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے۔ کوئی بڑا مخلص ملا تو اتنا ہی ثقہ اور دکھا بھیکا کوئی جتنے ہنسائے والا ہو تو یہ محسوس ہوتا کہ اس میں تھوڑا بہت گنہگار بھی ہے۔ کوئی بڑا عالم فاضل ہوتا تو اس میں نخوت تنگ نظری اور کم ظرفی بھی کسی کی حد تک پائی گئی اللہ والے ملے تو انہیں دیتا کے کام کا نہ پایا۔ کسی منکر خدا کو ایسا نہ پایا جو کچھ اور نہیں رسول کی شرافت و عظمت کا تو قائل ہوتا۔ لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اس خوبی سے ہمہہ برآ ہوتے کہ ان کی محبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ فلاں بگڑ گئی ہے جسے پورا کرنے کے لئے کسی اور کو دھونڈنا پڑتا ہے۔

میرا ان کا بیس بائیس سال سے ساتھ تھا۔ پہلے پہل ملا تو علی گڑھ میں لوہار دس مہینے طالب علم تھا جب ان کا ساتھ چھوڑا ہے تو سب کچھ تھا۔ دوسروں کے نزدیک بڑی سہمی اپنے نزدیک سہمی میں نے بھی اس مدت میں بہت کچھ دیکھا، سنا اور برتا ہے اور اپنے نزدیک اپنی ہر استعداد پر کچھ نہ کچھ اعتماد بھی رکھتا ہوں لیکن اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے ہر سلوک مجھ سے ابتدا میں رکھا وہی آخر دم تک قائم رہا۔ انہوں نے اپنی خلل واد و ذہانت و اخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔ اسے یوں سمجھ لیجئے کہ مولانا کی محبت سے جب کبھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے

کوئی سنتی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پریشان و بالوس ہوا تو ان کی صحبت سے  
ہشاش ہشاش اٹھا، رنج یا غم نہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہو گیا۔ خالی الدہن گیا تھا تو  
معلومات کے اس ناور و لطیف نکتوں سے بہرہ مند اٹھا جو شاید دلوں کے مطالعہ یا مشاہدہ حاصل  
نہ ہو سکتے۔

آج ہم دہائیس گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی میں بھی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں  
کی طرح مولینا خاص طور پر زہد میں تھے۔ ہر طرف سرسبکی چھائی ہوئی تھی۔ نفسی نفسی کا عالم تھا بڑے  
بڑے سوریادوں کے پاگل لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس وقت کا حال کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ  
عالم گرجا پڑے۔ اُس زمانہ میں میں نے مولینا کو دیکھا کہ کیا جمال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آ  
جاتا جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے اس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمد میں  
لوگ بیٹھے ہوتے، پچائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نہ نہ  
نہیں۔ کسی کی مجال تک نہ ہوتی کہ آنے والی آفت کا تذکرہ کرنا۔ ایک دن رشتہ میں میں بھی  
حاضر ہوا۔ میں مرحوم کی خدمت میں اکثر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا جو دوسرے کہنے میں ہمیشہ تامل کرتے  
تھے۔ میں نے کہا مولینا کیا ہونے والا ہے۔ خدا خواستہ نوع دیگر متواتر کیا ہوگا۔ کہنے لگے رشید  
میں بھی ایسا کہتے ہو۔ مجھے خیال تھا تم اس قسم کا ذکر نہ پھیرو گے۔ ہوگا کیا وہی ہوگا جو اول سے تعلیم  
میں ہو چکا ہے۔ مومن کی شان ایسی ہے کہ اس پر ہر اس طاری نہ ہوئے مگر ڈرو گے تو ان لوگوں کا کیا حال  
ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے پھر مڑنے بھگنے سے کیا فائدہ۔  
مولینا پر اس وقت ایک عجیب جلال سا طاری تھا اور مجھے شمنشا بہت روتا کا وہ غم  
یا دیا گیا جب گلاس نے روم پر قبضہ کیا اور حبشیوں نے فتح کے نشہ میں آکر سینٹ کا رخ کیا۔  
جہاں کا ہر رکن اپنی اپنی جگہ متانت اور وفادار کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جن میں سے ہر ایک کے حشیوں



۱۷ نے نشست ہی پر ذبح کر دیا۔ لیکن کسی سینیر نے نہ اپنی جگہ چھوڑی اور نہ آہ و نلاری کی۔ وہ دن گزر گئے جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہو چکا مرحوم بھی جوار رحمت میں پہنچ گئے، اس وقت میں اس زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسا درد اور کتنا بڑا سراسر ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی نہ تھا۔ اس وقت صرف مولینا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر ہمارے کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے تاریخی دامن پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے ہوئے تو بھی مولینا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا!

اسلامہ کا زمانہ ہے، نان کوپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے گائے کی قربانی اور معمولات پر بڑے بڑے سید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے اس زمانہ کے اخبارات، نقاد، تصانیف اور رسومات کا اب اندازہ کرنا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہے کیا ہو گیا اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ہو رہا ہے اور کچھ کما جا رہا ہے وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک نہیں کہتی تھی۔ کالج میں غیب افروز فری پھیلی ہوئی تھی مرحوم مطمئن ہو رہے تھے۔ لیکن نہ چرو پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق۔ اس زمانہ میں میں اسی دامن پر کے تقبی کروں میں رہتا تھا اور میرے اور مرحوم کے نشست کے کروں میں صرف ایک دیوار صدفاصل تھی جس میں ایک دروازہ بھی تھا۔ دن میں کتنی کتنی بار ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔

کہتے تھے رشید دیکھو، علماء کس طرح لیڈروں کا کھلوتا بنے ہوئے ہیں اور لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقی مسائل کو کیسا کیسا گھر گھر و بنا رکھا ہے۔ میری سمجھ میں اس وقت یہی باتیں نہیں آتی تھیں، اور نہ میں ان تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔ لیکن مرحوم پر ایک خاص

کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ رہ رہ کر انہیں باتوں کو چھڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اس قسم کے مناقشوں کا مرکز بنے لیکن کیا کروں، خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا موقع ملے گا اس دنیا کے لکھے پڑھے لوگ کیا کہیں گے۔

بالآخر مولینا نے ان مذاہمت پر قلم اٹھایا، اور دن رات قلم برداشتہ لکھتے رہتے۔ اکثر مجھے بتھا کر سنا تے اور راستے طلب کرتے۔ میں کتنا مولینا میری مذہبی معلومات اتنی نہیں ہوں کہ میں محاکمہ کر سکوں۔ آپ جو کتنے میں ٹھیک ہی کتنے ہوں گے۔ کتنے یہ بات نہیں ہے تم پر اس ہڑت کا اثر نہیں ہے۔ اور سمجھتے ہو کہ یہ سیکٹر وں علماء جو کچھ کتنے میں وہ ٹھیک ہے اور میں کالج کا مولوی ہوں ہی ہانکتا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم تم زندہ ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کون حق پر تھا اور کون ناخبر پرا

سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سرکاری میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اس کی سچائی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کے زوئیں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔ اس کا اعتراف کسی نے نہ کیا اور نہ کبھی مولینا نے کہا کہ ہم نے آپ نے مولینا کی اس خدمت اور قابلیت کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے دریافت کیا تو مرحوم نے منہس کر فرمایا۔ لیکن میں اُن کلمات کو جہان نہیں چاہتا۔ اس سے بد مزگی اور پیمیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

شاہد نسیم سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا، جو پور میں سیرت رسول کا جلسہ تھا۔ مرحوم کی تقریر ہو رہی تھی۔ جلسہ کیا ایک سبم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والدانہ پوش و وارفتگی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے، خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع ایک ہی متغفس تھا۔

اتنے میں دوسرے ایک بوڑھا اپنے قد منحنی شخص جھکا ہوا انہوہ کو چہرہ تاہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا ہے وہ خوف و عقیدت سے سمٹ کر عظیم دینا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ مرموم کو سیدہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا۔ اور واپس چلا گیا۔ یہ مولینا ہدایت اللہ خان صاحب جسٹس جوہر مرموم کے استاد اور برہنہ میں اس وقت علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔

مرموم میں اپنے استاد ہی کا جبروت و مظنہ تھا۔ ان کی شفقت میں بھی جبروت کا درما تھا۔ میں نے مرموم کو تھجا کر یا گول گول باتیں کہتے بھی نہ پایا۔ ایک بار میں مرموم کی خدمت میں حاضر تھا۔ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے آدمی نے مولینا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ مولینا براہ نوازش آج مشبک کھانا غریب خانہ پر تناول فرماتے۔ مولانا نے بغیر کسی تاہل کے بے لاگ کہا۔ نہیں جناب میرا آپ کا کھانے کا کھانا نہیں ہے نہیں ہو سکتا۔ وہ صاحب بڑے ضعیف ہوتے لیکن مرموم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہم سب سخت متحیر ہوتے۔ آخر میں مرموم نے فرمایا، جی ہاں میرا ان کا کوئی کھانا نہیں ہے۔ اس قسم کے کہنے اور واقعات میں، کئی سال کی بات ہے مرموم انجیر شریف جا رہے تھے۔ اتفاقاً وقت جس گاڑی سے مرموم سفر کرنے والے تھے اسی سے ایک بڑے ذہبی مہامت بزرگ کا..... یونیورسٹی کی طرف سے خیر مقدم تھا۔ ان سے مولینا آذر وہ تھے۔ انہوں نے شاید یہ سمجھا کہ مولینا بھی ان کی پذیرائی کے لئے تشریف لاتے تھے۔ دل میں خوش ہو کر آگے بڑھے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مولینا نے بغیر کسی پس پیش کے فرمایا ”جی“ اس سعادت کے لئے دوسرے آتے ہوئے ہیں میں ہاتھ نہیں ملاتا“ یہ کہہ کر اپنے ڈرب میں سوار ہو گئے۔ آج تک کسی بڑے آدمی کی آمد پر یونیورسٹی کے کسی جلسہ میں فریاد نہ ہوتے۔ کسی

بڑے آدمی کے گھر نہ جانتے تاؤ فیکہ اس سے یارا نہ نہوتا۔ مجھے معلوم ہے مروج کی ایسوں  
 ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین و مذہب سے دُور رہا بھی سرور کا نہیں اور ایسوں  
 سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے حیات عالم دین سمجھے جاتے تھے، ہر شخص محبت و احترام  
 کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت و ملت تھی کبھی اس  
 کی بہت ہی نہ ہوتی تھی کہ مروج کی صحبتوں میں بیٹھ سکے۔ مروج اس معاملہ میں بڑے کھرے تھے۔  
 کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی نالیف قلوب نہ کی۔ لیکن جن سے خاص تعلقات تھے ان  
 پر حیا چھڑکتے تھے۔ اس کی تکلیف سے مضطرب ہوتے اور اس کی خوشی سے باغ باغ ہو جاتے۔  
 مولینا کے خلاف اخباروں میں بڑے نامعلوم مضامین لکھے اور اکثر ایسے ناروا اور  
 بریکک حملے کئے گئے کہ انہیں یاد کر کے آج تک میل دل کر مٹتا رہے اور لکھنے والوں سے مجھے  
 قلبی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن مولینا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ آج تک میں نے ان کی زبان  
 سے کوئی کلمہ ایسا نہیں سنا جس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ مولینا پر اس کا کوئی اثر ہے ایک  
 دن معلوم نہیں کونسا موقع تھا، اس اخباری گندگی کا تذکرہ آیا تو مروج نے فرمایا اور اپنے  
 مخصوص قلندرانہ انداز سے پہلو اگے بڑھو۔ نہیں دیکھتے کون کہ رہا ہے۔ صاحبزادہ ہو یہی  
 دیکھتے ہو کہ کس کے خلاف کہ رہا ہے، لڑائی مجھے پسند ہے، لیکن بہادروں سے مسیواؤں سے  
 نہیں!

مروج کی شخصیت کا ایک عجیب کمال تھا جس کو میں محسوس نہ کرتا ہوں لیکن محبت  
 نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے مثال دینے سے یہ بات کسی قدر واضح ہو جائے مروج کے دن رات  
 کے اٹھنے بٹھنے والوں میں فردا فردا کوئی خاص جاذبیت نہ تھی لیکن یہی لوگ جب مروج کے  
 حلقہ میں بیٹھ جاتے تو یہ عجوبہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا، اور ہر شخص فردا فردا نہایت

دلپذیر اور بی بات کچھ افراد ہی تک محدود نہ تھی بلکہ مروجہ کے کمرلوں کے اندر جو چیزیں یہاں کھسی جاتی  
اس میں بھی ایک خاص کشش نظر آتی۔

کم بیش بیس سال سے مروجہ کے کمرلوں کے اندر کی تقریباً تمام چیزیں میری نظروں میں  
ہیں جو چیزیں یہاں آج سے بیس سال پہلے دیکھی تھی وہ آج تک موجود تھی۔ کرسیوں کی وہی ترتیب  
کتا بول کی الدری اسی جگہ تخت کی وہی جگہ وہی پوشش، کھنڈیوں کا وہی مقام، پاندان اسی  
کمرے پر، چھوٹے چھوٹے بکس اور ڈوگرے، تخت کے پائیں۔ آتشدان پر گھڑی، فوٹل چائے  
کا ڈبہ، دو چار پیالیاں، کھلی ہوئی رشلف پر باوامی کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کا انبار، تخت  
کے اوپر کھنڈیوں پر لٹکی ہوئی قیمتی کپڑوں کی شیر وانیل، اور خوش رنگ صاف ایسا معلوم  
ہوتا جیسے مروجہ کی شخصیت کے سبب ہمارے ترکیبی ہیں۔ اب ادھر سے گزرتا ہوں تو  
دو منزلہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی اور دل بھرتا ہے۔

میرا پہلا مکان دو منزلہ سے بہت قریب تھا، مردانے کے بیرونی دروازہ کے سامنے  
سڑک کی دوسری جانب درختوں کی کھلی میں دو منزلہ کا قوسی برآمدہ اور چوڑا نظر آتا تھا۔  
گھر میں کوئی زیادہ بیمار ہوتا اور طبیعت پریشان رہتی تو نہ کہیں جاننا اچھا معلوم ہوتا اور نہ  
گھر کے اندر رہنے کی ہمت پڑتی تھی، کبھی کبھی دروازہ سے باہر نکلتا تو مروجہ اپنے چوڑے پر  
لمبی کشادہ استقبائوں کا سپید کرتے پھرتے سر پر گول محفل کی ٹوپی اور پائوں میں دلی کی نازک کڑے  
جوئی پہنے سر نیچے کتے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر باندھے تیز تیز قدموں سے چل قدمی کرتے  
نظر آتے۔ دیکھ کر دل کو ڈھارس ہو جاتی، سوچتا کہ مروجہ اس وقت کوئی نہایت ہی اچھا شعر  
گفتا رہے ہوں گے، اگر بلا جاتوں تو وہ اس طرز سے خیر مقدم کریں گے کہ طبیعت بحال ہو  
جاتے گی۔ بس اتنا ہی احساس میرے نشکین قلب کے لئے کافی ہوتا۔ میں مکان کے اندر آ

جانا اور دعا کرتا کہ خدا اطمینان دے تو مولینا کے ہاں جاقول اور جی بھر کر ان کی شفقت، مرحمت اور لطافت و مہربانی سے جی سیر کروں۔

مروم کو میرے بڑے لڑکے اقبال سے بڑا انس تھا۔ حالانکہ ان کا نام مہر کسی پتے سے سابقہ تھیں تو انھیں وہ صرف ہندوئینوں کا تھا۔ کہ اسے بلا بھیجتے۔ گو وہیں بٹھاتے اس کا نام کدو رکھا تھا۔ پیشاب کدو دینا تو کہتے ابے کدو تو نماز نہ پڑھنے دے گا۔ اچھا کوئی ہرج نہیں کہ پیشاب بڑا ہو گا تو کہے گا مولینا بابا پر پیشاب کدو چلائے۔ جب یہ باتیں پاتل چلنے لگا تو اپنی دونوں ہاتھ کی انگلی اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ناچ بے کدو ناچ۔ اس کے بعد اپنے مخصوص و نشیں لیکن پرقاریں میں کہتے تو م تو م رے بابجے تو مری تو م تو م رے بابجے تو مری، ہاں ناچ بے کدو ناچ۔

سال ڈیڑھ سال کا تھا کہ ایک دن شام کو اقبال کو لے کر بھیک پور چلے گئے، بغیر سبب کو اطلاع کئے۔ دوسرے دن واپس آئے۔ بے حد خوش معلوم ہوا کہ پتے نے بالکل تنگ نہیں کیا۔ لیکن مروم تمام رات اس کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ انہوں نے بالکل اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ وہ یکا یک بغیر کسے سنے کیوں اقبال کو بھیک پور لے گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ایک بار دو دن کے لئے بغیر کسے سنے اقبال کو ٹونڈل لے کر چلے گئے۔ ایک دن اسی زمانہ میں بچہ کو دیکھ کر کہنے لگے کدو سبز اباب تجھے کڑے نہیں پہناتا۔ اچھا دیکھ تیرے لئے میں کپڑا بناؤں گا۔ چند ہی دنوں بعد دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت ہی پرتکلف اچکن پہناتے ہوئے حسب معمول اسے نچا رہے ہیں۔

حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں سے اقبال کے لئے ایک نہایت خوبصورت چند اور عقال لائے۔ اقبال رات میں رونا تو صبح کے وقت مولینا کا آدمی ضرور آتا کہ رات کو کدو

کیوں رویا۔ اسے بھیج دو۔ اقبال بڑا ہوا تو اکثر کھانے پینے کی چیزیں خور لے کر جاتا، مہر م بہت خوش ہوتے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ دے کر واپس کرتے۔ کھانے پینے کی چیزیں، میوے پھل ہمیشہ بھیجتے رہتے اور کدلا بھیجتے کہ یہ کدو کے لئے ہتے۔ وفات سے سال سوا سال پہلے صحت اچھی نہیں رہی تھی۔ اقبال کچھ لے جاتا تو کہتے ابے کدو اب میں بیمار ہوں اور بڑھا ہو گیا۔ اب تیری لائی چیز کیسے کھاؤں۔

اکثر کما کرتے اقبال کو میرے ہاں بھیج دیا کرو میں اسے عربی فارسی پڑھاؤں گا۔ اب کدو بڑا ہو گیا۔ اب نہیں ناچے گا اس لئے اب اسے دوسرا ناچ نچاؤں گا۔ اقبال کچھ دنوں تک بہت بیمار رہا، میں پریشان رہنے لگا مہر م نے سنا تو فرما لے لگے ارے کدو کا جگر خراب ہے کھراؤ نہیں کوئی بات نہیں، ڈاکٹروں کی بات میں نہ آؤ۔ یہ کتابی باتیں بناتے ہیں، مریش کو نہیں پہچانتے، پہاڑ لے جانا چاہتے ہو تو لے جاؤ، فائدہ نہ ہو گا، لیکن کدو سے کہہ دو نا چتا رہے۔ تو تم رے بابے تو مڑی!

میرے مضامین کے بڑے شائق تھے، خود پڑھتے اور اپنے محصلوں اور بے تعلقات دوستوں کو سناتے، میں انہیں مضمون کے بارے میں اپنی رائے بھی سناتا دیتا اور یہ بھی بتا دیتے کہ کن کن کو انہوں نے مضمون سنایا اور کس کس نے کیا کہا۔ لیکن اکثر اس کے خلاف بھی ہوتا۔ ایک دن یونیورسٹی آف انس سے آئندہ اسٹریجی بال کی طرف آرہے تھے۔ میں سڑک سے گزر رہا تھا، سلام کیا بولے، اچی یہ کیا غم مہمل کھنے لگے ہو۔ اس دفعہ کا مضمون بڑا خوب تھا۔ ہاں بالکل بے سرو پا، اچھا جاتا ہونا کام دیکھو، میں نے چاہا کہ کچھ کہوں کہنے لگے بس بس آج اتنا ہی وہ دیکھو تمہارا یاد آ رہا ہے۔ جاقو!

مہر م کی سبیر کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا کہ جو چیز دیکھتے تھے اس میں کوئی نہ کوئی

خاص بات ضرور ہوتی۔ بڑی دلکش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اس کے ساتھ کوئی خاص اثر  
 وابستہ ہوتی۔ ہمیشہ پاکیزہ و نیکستی اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے  
 ادنیٰ کپڑوں کا بڑا شوق تھا۔ شیریوانی یا روئی دار چکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دلکش ہوتا۔  
 ایک دفعہ افغانستان سے ایک گرم عباسی کاغذی تھی، فائنٹی رنگ کا کپڑا جس پر پراچھڑے  
 ہوتے ریشمی جھول کاڑھے گئے تھے۔ ایک دن میں پہنا تو بولے خوب آتے۔ چھ دن وہ عجا  
 تولانا۔ یہ بھی کیا کہیں گے کہ مولوی کے پاس کیسے کیسے مال طغیت نہ بن۔ عباداتی گئی بڑے  
 شوق سے پہنا، بولے یہ اتار تے چلے، میں بہت قریب پہنچ کر دیکھنے لگا۔ بولے خیر سرت  
 تو رہے اس قدر انماک کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے؟ میں نے عرض کیا کیا کہوں۔ اسی  
 طرح کی ایک چیز اس دن جلسہ میں نواب منزل اللہ خاں کو پہنے دیکھا تھا، ان کے قریب  
 تو جانے کی ہمت نہ ہوئی آج اب کے پاس ویسی ہی چیز دیکھی تو کہا موقع اچھا ہے اس  
 تخت طاؤس کو ذرا چھو بیٹھا بھی لوں۔ بڑے زور سے مہنت، کہنے لگے باز نہ آؤ گے،  
 اچھا ایک پان بناؤ اور یہ تو بناؤ وہ منہ مار بارڈا کر کس جے، بڑا آدمی رہے، ذرا محنت  
 اچھی نہیں۔ پئے۔ میں نے کہا جی ہاں ان دنوں محنت اچھی نہیں ہے، برسے یہ کیا، میں  
 کنت ہوں اس کا ساتھ نامعقولوں سے بڑا ہے تم کہتے ہو محنت اچھی نہیں پھر آواز دی  
 مجھ کو ذرا ایک طشتی میں رشید کے لئے پٹری تولانا۔

مروجہ کے معمولات بھی غیر معمولی تھے، سردیوں میں باہر سوتے تھے، ابتدا میں تو بیکل  
 صحن میں لیکن اواخر سب سالوں سے برآمدہ میں آرام کرنے لگے تھے۔ گرمیوں میں اندر  
 رضائی اوڑھ کر، بستر گزار، چادریں سُفیری، تیکے متعدد۔ بچکے کا کوئی دستور نہ تھا۔  
 گرمی میں نہ برف کا پانی مل سکتا تھا نہ سردی میں گرم پانی۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ سپینہ آنا



بہت اچھا ہے۔ شام کا نانا اور صوب میں بیٹھنا منع کرتے تھے۔ دوسرے کے تولتے  
 یار و مال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے۔ ننگے سر شکل دیکھے جاتے تھے، گفتگو بلند آواز سے  
 کرتے۔ کاناجھوسی گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ملکے، مقررانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلی کی پرزہ  
 ملل کا لمبا بڑی کشادہ استینوں کا کڑیہ پہنتے۔ جس کے نیچے ہمیشہ ملل کی بٹن دار صدی  
 ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔ کسی کو اچھا کپڑے پہنے دیکھتے تو  
 خوش ہوتے اور فخریہ کرتے ناپسند ہوتا تو کہہ دیتے۔ سالن بڑی تر مڑ چل کا پسند تھا۔  
 ہمیشہ چٹائی پر اگر لوں بیٹھ کر کھاتے، نوکر دل کا بڑا پاس رکھتے۔ لکھنے میں سطر کبھی  
 نہیں سیدھی ہوتی۔ جسے دوست رکھتے اُس سے نہایت خوش ہو کر آگے بڑھ کر  
 جی کھول کر ملتے اور کوئی نہ کوئی خوش طبعی یا خوش دلی کا فقر ضرور کہتے۔ مڑ خوب ہنسی جانتے  
 ہی نہ تھے۔ نہ کسی کے علم سے نہ کسی کی دولت سے نہ کسی کے اقتدار سے۔ مذہبی  
 عقائد میں کٹر، سلوک میں بے لوث، جو جتنا چھوٹا ہوتا اس سے اتنی ہی فروتنی سے  
 ملتے۔ بڑا ہوتا تو اُس سے کہیں اور۔ بڑا ہو کر ملتے۔ علم کا وقار ان کے دم سے تھا

معزز و محبوب مولوی میں نے ان ہی کو پایا

قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم و نازک، آنکھیں پٹی  
 جن میں جذبات کا آنا چڑھاؤ جھلکتا رہتا نظر تیز و پرامن تھا، انداز میں بالکلیں انگلیاں  
 ایسی جن میں فلم شمشیر و رباب سمجھی زیب دیں۔ آواز میں کوٹک اور لچک، دھمک  
 بھی۔ خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا معصی اُلت دیں گے۔ ناز پر مھانے تو معلوم  
 ہوتا کہ خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت  
 کا احساس ہے۔

جمعہ کی ایک نماز یاد ہے، جاڑے کے دن تھے، بیخ بھری ہوائیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا  
 بگ وریڈ میں سوتیل بن بن کر اترتی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب دینیات غالباً سوہروردہ تھے مرحوم  
 اہانت کے لئے آگے بڑھے۔ تبخیر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ مولینا نے کما اللہ اکبر ایسا معلوم ہوا جیسے  
 اس حدائے فضا کی ہر صدا کی لرزش چھین لی۔ اس کے بعد جو قرأت شروع کی ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا۔  
 جیسے خالد کی تلوار میدان جہاد میں گونڈتی گونڈتی گئی پلکتی کاٹتی، سمٹتی تیرتی ابھرتی آگے برصغیر پہلی جا  
 رہی ہے۔ کوئی لمبی سورۃ تھی۔ جب تک ختم نہیں ہوتی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے جسم و جان ہیں بھلیاں بھر  
 گئی ہیں۔ اور شوق خود سپاری میں ملبہ نہیں دو دو وار بھی جھوم رہے ہیں۔ اس دن کی نماز اب بھی  
 یاد ہے اور وہاں اس پر ایمان بھی ہے کہ وقت آگیا تو شوق شہادت دنیا کے ہر شیب و فلز اور  
 زندگی کے ہر نال و تذبذب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا!!

مرحوم ایسوں سے کبھی علمی گفتگو نہ کرتے جن کے بارہ میں ان کو یقین ہوتا کہ اس کو علم کا گہمند  
 ہے یا علم کی گڑتی یا ذہن نصیب نہیں ہے یا صرف دنیوی اقتدار کا حامل ہے۔ اگر کوئی پھیر بھی دینا  
 تو ٹال جاتے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ کوئی دوسری بات کیجئے آپ کو ان باتوں سے کیا سروکار  
 البتہ شائع ہوتی تو اس کا ایک نسخہ سراقبال مرحوم کو بھی بھیجا تھا۔ اتفاق سے کچھ ہی دن بعد  
 اقبال مرحوم اپنے لکھنؤ کے سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لاتے۔ کھانے پر ایک جگہ مرحومین کی  
 ملاقات ہو گئی۔ البتہ کا ذکر چھپر گیا۔ سراقبال مرحوم نے بڑی تعریف کی اور فرمایا مولینا آپ نے  
 عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن نہیں منتقل  
 ہوا تھا۔ گفتگو چلتے چلتے ایک ایسا موقع آیا جب سراقبال مرحوم نے فرمایا کہ مولینا دوسرے  
 ایڈیشن میں اگر اس بحث کو بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیجئے تو بہتر ہوگا۔ ایک ذی وجاہت بزرگ جن کو  
 یونیورسٹی کے نظم و نسق میں کافی عمل دخل تھا اور اپنے سن و سال اور قومی خدمات کے اعتبار سے

بھی علی گڑھ کی دنیا میں بہت کچھ اہمیت حاصل تھی۔ مروجین سے ذرا فاصلہ پر دسترخوان پر موجود تھے۔  
 ٹیبل سے آواز دی، ہال مولینا میری بھی وہی ملتے ہوئے جو سراقبال نے دی ہے، دوسرے ایڈیشن میں  
 .....؟ اتنا ہی کہہ پاتے تھے کہ مرحوم نے لکھا کہ ..... صاحب بس  
 کیجئے، آپ کھانا کھائیے، آپ کو ان باڈن سے کیا نسبت۔ ان باتوں میں نہ پڑتیے۔ کھانا  
 کھائیے۔۔۔۔۔ ملاحظہ فرمایا نہ۔ ہاں۔ بس کھانا کھاتے جاتے آ

ایک اور بزرگ جن کے بارہویں کچھ نہ کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ وہ بیات کے نصاب  
 سے دل چسپی لینے لگے، کتابوں پر جہاں تہاں نشانات لگا کر مرحوم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔  
 توقع یہ تھی کہ مرحوم تباہ و تباہیالات سے ان کی عزت افزائی فرمائیں گے۔ مرحوم نے تحریری کوئی جواب  
 نہیں دیا۔ ایک صاحب کی البتہ کسلا دیا کہ کتابیں موصول ہوئیں۔ انہوں نے اسی کو غفیت سمجھا۔  
 ایک دن حلقہ چاتے نوشی میں اگر شرابیک ہوئے اور خضیا لوجی کا تذکرہ پھیر دیا، مرحوم نے نہایت  
 سنجیدگی کے ساتھ فرمایا، آپ کو وہ بیات سے کیا واسطہ، آپ کے اپنے مشاغل کیا کم ہیں کہ دینیات  
 کی طرف توجہ فرمائیں۔ وہ صاحب خفیف ہو کر خاموش ہو گئے۔ غصہ ٹوٹی ہی دیر میں آموں کا تذکرہ  
 آگیا۔ اس میں فواد نے بڑی انماک سے حصہ لینا شروع کیا۔ مرحوم نے فرمایا یہ ٹھیک ہے۔  
 اس پر گفتگو کیجئے۔ ملاحظہ فرماتے ہو نہ، یہ آپ کا حق ہے۔

کچھ دنوں کی بات ہے کہ مرحوم کے ہاں ایک بڑے سن رسیدہ بڑے بزرگ اور بڑے  
 جید عالم ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپس میں بنے نکلنے غمی ورنہ ظاہر ہے خالفتاہ میں کسے نیند  
 آسکتی تھی، چلتے کی سردی تھی مرحوم سب معمول برآئدہ میں سو رہے تھے اور حسان کوہ کے اندر  
 حسان تجد کی ناز پر مٹنے اٹھے حوزہ کھولنے پر مرحوم کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا کون؟ جواب ملا،  
 کوئی نہیں میں ہوں۔ بسے فرماتے کما وضو کروں گا، بسے تو کیجئے کسی کی نیند کیوں حرام

کرتے ہیں۔ انہوں نے دینی زبان سے کہا، تھوڑا گرم پانی مل جاتا۔ فرمایا بہنم میں، ہمسایہ لے کما مکرار شاو ہو پودے طور پر سن دیا، بولے گرم پانی بہنم میں ملے گا۔ انہوں نے جواب دیا تو اٹھوڑا بتاؤ مرحوم نے فقہہ لگایا، بولے غیند تو غایت کی لیکن فقرہ خوب کما۔

ایک دن کلاس پہنچے، خلاف معمول بہت کم لڑکے نظر آتے پوچھا کیا بات ہے معلوم ہوا باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوتی ہے، بڑے محرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولینا چٹھی دے دیجئے تو ہم سب بھی بیچہ آئیں، بولے ہاں چٹھی ہے مقصود حاضر چٹھی۔ لڑکے نے جواب دیا مولینا حاضر چٹھی لے جئے گا تو بہنوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضر چٹھی مقصود چٹھی، ہتھاری نہیں، باؤ جاتو تم بھی بیچہ دیکھ آؤ!

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں کلاس میں نواح جامی اور گلشن راڑ پڑھایا کرتا تھا۔ ان میں بعض مقامات میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی ذہنیں لے کر مرحوم کے پاس پہنچ جاتا۔ بڑے خوش ہوتے کہتے بیچو، میں کتنا مولینا کلاس شروع ہونے والی ہے صرف تین دن مقامات میں جہاں اکتا ہوں فرمایا ہی تو مصیبت ہے تفصیل سے بانٹیں نہیں ٹھنٹے تھوڑا سا پا لیا اور بھاگ نکلے، طالب علم نہیں کہتے یہ کام اٹھائی گئے نہ ہائے۔ پچھڑیاں ہوں ڈگریاں، سب اٹھائی گئے، علم کی عظمت باقی نہیں رہی تو طالب علم میں سعادت کہاں سے آئے۔ میں نے کہا مولینا گھنٹا ہونے والا ہے سمر اٹھائی گئے دل پہلے تو اراقت آتا ہے کہتے اچھا اچھا بولو پڑھو، میں پڑھنا شروع کرتا بیچ ہی میں روک دیتے۔ کہتے معلوم ہے پھر اس کی وضاحت کر دیتے اور چلنے لگتا تو کہتے دیکھو میرے کتنا ہوں قرآن پڑھتا۔ نواح جامی اور گلشن راڈ کلاس میں پڑھا دے لیکن قرآن پڑھے بغیر دیکھے پڑھوں کے مجمع میں ان مباحث کو مت سمجھنا نا اگے تم جاتو تمہارا کام اور ہاں ایک پلان کہتے جاتو۔ میں نے کہا جی نہیں کلاس بھاگ جاتے گی۔

کہتے ٹھہرو ٹھہرو، پڑھنا آتا جائے تو کلاس بھاگ جاتے تو بھاگ جاتے پڑھنے والے استکار کرتے رہیں گے۔ پان تو کھاتے ہی جاؤ۔

ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خلیفہ سلیمانہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا لیکن اکثر بار بار جاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ تذکرہ صدر بزرگ بھی آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے شاگرد تھے۔ چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تفریق و تو صیغ میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دیکھا ممکنہ نیم جرمہ بلینے ہوتے فرمایا جاتی میں تو مولانا لطف اللہ صاحب کی کراہت کا بھی قائل ہوں۔ نووارد نے تعجب میں آکر پوچھا مولانا یہ کیونکر مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا اور جوانوں نے آپ کو چڑھا دیا یہ کراہت نہیں تو اور کیا ہے!

کئی سال ہوتے ایک رات گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ زانی سواریاں آتی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا چلو مولانا کے ہاں ہواؤں، پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کلاسکل چھوٹی گول میز کے سامنے اپنی کرسی پر ہلاؤں اٹھائے اٹھوں بیٹھے ہوتے کوئی چیز غور سے پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا محل تو نہیں ہوتا۔ بولے بیٹھ جاؤ، ابھی بناتا ہوں۔ میں بیٹھ گیا، عینک کے اوپر سے نگاہ کر کے بولے، ٹھکانے سے بیٹھو، گپ ہوئی غصہ مڑی ہی دیر میں پرچہ علیحدہ رکھ دیا، عینک کو اس کے خانہ میں رکھا پھر بولے سنو۔

ادھر رہ گئی یا ادھر رہ گئی

وفا کی شکایت مگمگہ گئی

”بے نظیر شاہ“ کو جانتے ہونہ، میں نے کہا جی، شاہ صاحب کو کون نہیں جانتا، کھٹے

ازل میں ہر انجم لکھا گیا  
شبِ ظلم کی لیس کن سحر و گنتی

بولے یہ شخص چھوٹی بجر میں کہنے کا بادشاہ ہے، میں نے کہا درست بادشاہوں کا کیا کہنا، بے اختیار ہو کر فرمایا، وہ بھی ٹھیک کہتے ہو، ہاں ہاں ہم سمجھے، بادشاہوں کا کیا کہنا۔

میں نے کہا تو کیا اسی کا مطالعہ ہو رہا تھا، فرمایا نہیں، ایک اشتہار تھا، میں اشتہارات اکثر پڑھ لیا کرتا ہوں اس سے تمہاری قوم کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ یہود کا اشتہار تھا۔ دنیا میں اور امراض کی دواؤں کا بھی اشتہار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی مرض ہے، بدمذہب دیکھو، اسی کا چرچا، جس طرف دیکھو قوتِ مروجی کا نام، جہاں دیکھو مایوس العلما، اس سے اندازہ کرو کہ ہمارے کیا کثرت ہیں، کیا خیالات ہیں اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو تمہاری اردو کہاں جا رہی ہے۔ شروع سے آخر تک یہی اشتہارات۔ یہی امراض۔ میں نے کہا جی ہاں، فرمایا، اچھا اچھا، کھانا کھایا ہے، میں نے کہا جی نہیں، کہنے لگے یہ بھی اچھا ہوا۔ میں کھاؤں تو کپ ہو گئی، تمہیں نہیں کھلاؤں گا۔ آج کل صرف ایک پھل کا اور کدو گشت کا سیٹھا پھیکا مغربا ہوتا ہے۔ بھوک لگی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ تو قائم سی ہو گئی ہے، ہنسنے آواز دی، ہا، نکتیوں کے لٹو لاؤ۔

لٹو آئے تو بولے کھاؤ، منیر کے ہیں منیر کے۔ منیر کا نام سننا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ خط و کتابت بھی کر رہی ہے، بولے ہائیں یہ کیا؟ میں نے کہا وہی بلازمِ مٹمس الدین و زین الدین ہنسنے فرمایا خوب یاد رکھا اور ہاں ایک کدو کے لئے لیتے جانا۔ کدو اب نڈا ہو گیا۔ ہاکی کھیلنا ہے۔ خوب ناچتا تھا۔ کدو کہیں کا؟

کھانے سے فارغ ہوتے حسب معمول صراحی سے براہ راست حلق میں پانی اونٹیل کر لیا۔  
 ہاتھ دھوئے اور اپنے سرخ لمبے چوڑے رومال سے ہاتھ منہ پونچھتے باہر نکل کر جو تڑپے پر بندھے  
 پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک خلل کرتے رہے، میں نے پلان بنا کر دیا اسے لے کر منہ میں رکھا  
 موندھے سے ذرا ایک طرف مائل ہو کر پہلی پیک براہ راست ہتھیل کے چکر دار گالڈان میں ڈالی۔  
 جو ٹھیک سوراخ میں جا گری، اور اگلڈان کے ماسیہ پچھینٹ تک نہیں آئی۔ مرحوم اسی طرح  
 اپنی اونچی گرسی پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے نیچے اگلڈان میں پیک ڈالتے تھے۔ اور کہیں ادھر  
 ادھر اگلڈان پچھینٹ نہ پڑتی۔

فہرستی مہینہ کا شاید تیسرا ہفتہ تھا، اکتوبر کا مہینہ، رات کسی قدر ٹھنڈی لگتی تھی۔ چاند  
 افق سے کچھ ہی بلند ہوا تھا۔ لیکن اس کا دم نہ تاک اُجالا، درختوں کی پتلیں اور عمارات کے  
 کنگڑوں پر نمایاں ہو چکا تھا۔ بولے کل رات میری طبیعت گھبرائی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ  
 کیا کروں۔ بالا خروں میں آیا کروں سے گفتگو کروں۔ کہو کیا سمجھے، میں نے کہا بالکل  
 نہیں سمجھا۔ کہا ہاں مردوں سے۔ پھر اس کی وضاحت کی فرمایا۔ میں نے وہ پلندہ نکالا۔  
 جس میں ۲۵-۳۰ برس کے خطوط رکھے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں میں سے جو وفات پا چکے  
 ہیں ان کے خطوط۔ وہ خطوط جو انہوں نے زندگی میں لکھے تھے۔ ان سب کو نکالا بعض بالکل  
 شکستہ تھے۔ بعض کی سواد تحریر بے نور ہو چکی تھی۔ بعض اس طرح لغافوں میں رکھے ملے۔  
 جیسے ان کو میں نے کھولا ہی نہیں تھا۔ مرنے تک چھپا کر رکھتی ہیں۔ انہیں میں نے بڑی احتیاط  
 سے کھولا۔ ڈر کر جیسے کبھی بے اختیار ہو کر کبھی مسرور ہو کر کبھی بھوک کر کھولا۔ ان ہی باتیں  
 کہیں۔ وہ زمانہ یاد آگیا جب زندگی عبارت تھی ان کے خلوص سے ان کے بھگڑوں سے  
 ان کی فرمائشات سے۔ کسی میں کسی کے آنے کا مزہ تھا۔ کسی نے بلایا تھا کسی نے مجھے

پریشانی میں تسکین دی تھی۔ پھر میں بالکل بھول گیا کہ یہ لوگ مر چکے ہیں مجھے یقین ہو گیا کہ سب زندہ ہیں۔  
میں ہی مر چکا ہوں۔

پھر لوہے، اور نہایت رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگے، تم جانتے ہو۔ بھائی صاحب مرحوم پورے  
پاگل تھے۔ میں نصف پاگل ہوں۔ کبھی کبھی پورا پاگل ہو جاتا ہوں۔ اس وقت ناواقف مجھ سے  
آزاد ہو جاتے ہیں لیکن جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں۔

ہاں تو عجیب عجیب خطوط ملے۔ پاگل کا ذہن ہم کو معلوم ہے کبھی کبھی ایسا سیر ایسا  
اور ایسا رنگین ہو جاتا ہے کہ بس..... اس کا احساس صرف پاگل ہی کو ہو سکتا ہے۔  
مجم کو ہوتا ہے؟ میں نے کہا جی نہیں لیکن ہو کر رہے گا خوش ہو گئے۔ کہا ایک پان اور بڑا  
میں ذرا پانی پی لو۔ پان کھا کر اور پانی پی کر غوطا ٹٹلے پھر ٹھیکے گئے۔ کہنے لگے یہ ذہن اور اس کے  
تصورات عجیب ہیں۔ پاگل کی ذہنی سطح ذی حواس کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہوتی ہے بہت  
واضح اور نہایت باحسی۔ وہ نہاری عقل اور نہارے اکتسابات شعوری وغیرہ شعوری سے آزاد ہوتا  
ہے۔ اس کے تصورات زیادہ مخلصانہ ہوتے ہیں۔ وہ حقیقت پالیتا ہے۔ نتیجہ نہیں استنباط کرتا  
اس کو نتیجہ استنباط کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

ہاں تو..... کا خط دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے موجود ہے۔ میں نے اسے  
سچوا۔ میرا گھر بنا رہا تھا۔ محبت سے محنت سے۔ یہاں دوڑ کر جاتا ہے، دواں سے آواز دے  
رہا ہے۔ غوطہ ڈی دیر کے لئے رک گئے۔ پھر لوہے..... کو جانتے ہو؟ میں نے کہا پورے  
طوبہ پر یاد نہیں کہنے لگے وہ بھی موجود تھے۔ جوں کا توں لغافہ میں بند۔ پھر رُکے کہنے لگے صوبہ موجود  
ہیں۔ خوب بات کرتے ہیں۔ مہنتے ہیں۔ اب قبرستان میں سوتے ہیں لیکن میرے ہاں جھٹکتے جھٹکتے  
ہیں۔ سچوں کو بند کر رکھا ہے.....“



اتنے میں ایک تانکا آیا۔ ایک صاحب نے انہر کسی کا پتہ دریافت کیا۔ معلوم ہوا جیسے مرحوم کے ارد گرد تصویرات کی جو نیم شغلات اور نیم غیر شغلات معمول جھلیاں قائم ہو گئی تھیں وہ ایک بیک فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ بولے بھائی آگے جاؤ یہاں کوئی نہیں۔ میں نے کہا رات زیادہ آئی۔ اب گھر جاؤں گا۔ کہا جاؤ۔

عمرہ کی بات ہے ایک دن خود بخود فرمانے لگے ہم اس معاملہ میں مبتلا تھے کہ ہم جیسا طبی شاید ہی کہیں لے۔ لیکن ایک ہم سے بھی زیادہ بڑے دل لفظ۔ صبح کرو میں سورہات کا استعمال رضائی اوٹھ کر اور کر رہا ہوں کہ ایک صاحب نشست کے کمرے میں آتے دیکھا کوئی نہیں ہے۔ سونے کے کمرے میں آکر دنگ دی اور سلام علیک کچھ اس انداز لہجہ سے کہا کہ میں ہونک ہڑا رضائی کے اندر ہی سے جواب دیا علیکم السلام انہوں نے فرمایا مزاج خریف، میں نے کہا ابھی آکھو لگی تھی، فرمایا مولانا میں نے آپ کے ملاحظہ کے لئے ایک کتاب بھیجی تھی۔ جواب میں عرض کیا گیا۔ بھیجی ہوگی۔ آتی ہی رہتی ہیں، بولے آپ نے مطالعہ کیا، میں نے کہا یہ کیا مفروضہ ہے کہ مطالعہ کی جاتے۔ یہ سب کچھ وہ کھڑے کھڑے فرما رہے تھے۔ اور میں رضائی کے اندر ہی سے جواب دے رہا تھا۔ اتنے میں آواز آئی، مولانا آپ کی دوبالوں کی شہرت سنی تھی ایک اخلاق کی اسودہ سے علم کی۔ اخلاق کا سال تو معلوم ہو گیا علم کی بھی کسی دن تقدیر ہو جائے گی۔ سلام علیکم میں گڑ بڑا کر چلا پاتی سے اٹھا اور جلدی جلدی نشست کے کمرے میں آیا لیکن وہ جا چکے تھے۔

مرحوم دوست بنانے اور علاج انتخاب کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے منجھری علاج سے فائدہ نہیں ہوتا سعالج سے فائدہ ہوتا ہے۔ جب تک سعالج ٹیکر کا دھو مریض کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک قعدہ سنایا۔ کہنے لگے ایک دفعہ خیال آیا کہ دلی کے کسی صلیح سے رجوع کروں۔ چنانچہ بہت عرصہ فکری اور تلاش کے بعد ایک ایسے

طعیب کا انتخاب کیا گیا جو طب میں دہلی کے بعض مشہور اطباء کے استاورہ چکے تھے ان کا نام بھی بتایا تھا لیکن یہاں مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا رہے۔ اسی پچاس سال کا سن بڑے مدتیں، پرہیزگار اور صاحبِ کمال تھے۔ ان کے خیالات بھی عجیب و غریب تھے، یہ ناممکن نہ تھا کہ ان کے مطلب میں کوئی شخص ترکی ٹوپی اور طوطہ کرہ چلا جائے۔ ایک صاحب سوٹ پہن کر آگئے تھے تو ایسے پھرے کہ سارا مطلب زیرِ وزن برہونے لگا۔ اور جب تک وہ چلے نہیں گئے چین سے نہیں بیٹھے۔ کہتے تھے دیکھو تو جہاں میں ناز و پڑھتا ہوں وہاں میسرورہ ترکی ٹوپی اور کرٹ پتلون پہن کر چلا آیا۔ مروجہ نے ان سے ملاقات کی۔ بڑے نپاک سے ملے۔ مروجہ نے اپنی شکایات بیان کیں۔ بھوک نہیں لگتی، قبض رہتا ہے، بخیر کی شکایت ہے، بیانات منتشر اور پرآگندہ دیتے ہیں۔ اختلاف کی تسکلیف ہو جاتی ہے، کبھی کبھی خفقا کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، نیند بہت کم آتی ہے۔ وغیرہ۔

بحکم صاحب سب کچھ محبت خود سے مشتے رہے اور اکثر اس طوطہ پر ہلا دیتے تھے گویا ہر بات دل نشیں ہوتی جا رہی ہے۔ جب مروجہ کناٹھ کر چکے تو حکیم صاحب بولے ٹھیک ہے۔ بالکل بجا فرمایا، ایسا ہی ہوتا ہے، ایسا ہونا چاہیے۔ مروجہ نے فرمایا کوئی نسخہ تجویز فرما دیجئے۔ تو بولے، جی نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، شرفا کا مرض ہے، شریفوں کو یہی شکایات لاحق ہوتی ہیں۔ مروجہ نے فرمایا آخر کوئی علاج، بولے بالکل نہیں، کوئی مرض ہو تو علاج کیا جانتے، اگر انہیں شکایات میں مبتلا ہوتے ہیں۔

میری طالبِ علمی کا ابتدائی زمانہ نفا کا لچ کھانے والا تھا، مروجہ وطن سے تشریف لا رہے تھے۔ میں الہ آباد میں ملا۔ مروجہ گنڈولاس میں سفر کر رہے تھے اور مروجہ کے بڑے بھائی جو حرم سے اپنا دامانی نوازن کو بیچے تھے ہمراہ تھے۔ اسٹیشن پر مجھے دیکھا، بولے اچھا، کھا نا کھایا

جاتے گا۔ میں نے کہا میں سیکٹر کلاس میں کیسے بیٹھوں، کھانا کھانے کے لئے ہر کلاس برابر ہے۔ کوئی پوچھے گا تو میں سمجھ لوں گا۔ تم تو اسی جاؤ۔ ایک انگریز بھی اسی ڈب میں تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا اور جو یہ فورٹ ولیم بیٹھا ہوا ہے۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں یا رہے آ جاؤ۔ میں اندر آ گیا۔ انگریز نے مولینا کی طرف اس طرح دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مولینا کی تجویز سے اتفاق کرتا ہے۔ مولینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا ہاں بیٹھے رہو۔ سب بیٹھا گئے۔ سمجھنا کھانا کھاتے گا۔ اس نے اشارہ سے ظاہر کیا گویا وہ ہر طرح مامنی وغیرہ دہئے۔ کھانے سے البتہ معذور رہے۔

نصف ڈب میں مولینا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ہر طرح کے بس بستر، لڑکریاں، ڈبے، گھڑیاں، مراچی، پاندان، کھانے کا سامان کیا گیا۔ ایک پوری برتن کھالوں سے بھر گئی۔ ہر طرح کے کھانے، ہر ذائقہ کے حلویے، مٹھائیاں ان کے علاوہ، کہنے لگے یہ کھاؤ، ہماری طرف کی خاص چیز ہے۔ نیب کی کوئیل اور کلیاں تیرے کے ساتھ کافی گئی تھیں۔ بڑی تیز دھڑکی ڈالی گئی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا سالن خالص ہری مرچوں کا تھا پر اسٹھے، سنہ پھیاں اور پوریاں علیحدہ تھیں، بڑے مڑے سے کھانا کھایا گیا، کہنے لگے خوب کھاؤ والدہ نے پکایا ہے یہ نعمت کہاں ملتی ہے۔ سمجھتے ہو، ماں نے پکایا ہے۔ ہاں۔ وہ پر خیال کر کر کے کیسی خوش ہوتی ہوں گی۔ کہ سلیمان کھا رہا ہے، کھلا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی جو سفرِ حشر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے کھانے میں شریک ہوتے۔ کہیں ہی بڑے تکلف و عورت یا معزز ہمان کہوں نہ ہوتے یہ ہمیشہ شریک رہتے تھے مرحوم ان کو بھائی جان کہتے تھے۔ بھائی جان بولتے بالکل نہ تھے۔ دوسرا خان پر یک یک ہاتھ اور جو کچھ جی میں آتا اور جس طرح جی میں آتا کھاتے اور فوراً اٹھ کر چل دیتے۔ بھائی جان کی طرف

دیکھ کر کہتے کیوں بھاتی جان ٹھیک ہے نا۔ وہ حسب معمول بالکل جواب نہ دیتے۔ ماں کا نام اور نانا بے مرحوم کی جویش اور محبت بھری باتیں سن کر ہلو بدل لیتے۔ اور جلدی جلدی ہنس نہ میں ہاتھ ڈالتے، کچھ ٹوٹتے اور حقوڑا بہت اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔

اسی زمانہ میں میری والدہ مرحومہ نے رحلت فرمائی تھی۔ مرحوم نے ماں کی باتیں کچھ دینی رفتگی سے بیان کرنا شروع کی تھیں۔ کہ میری طبیعت بھرا آئی مرحوم نے دیکھا اور بغیر کسی ارادہ یا تکلف یا قطع کلام کہتے ہوئے، یا کھانے کی طرف سے توجہ مبذول ہوتے کہا، ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ہونہ چکا خیال فرماتے ہوں ہوں چکا، بڑی خوش نصیب تھیں کہ تمہارے سامنے میں تم ان کے سامنے نہ مرے ان کو یاد رکھو، ہمیشہ یاد رکھو، ماں کو کون بھولتا ہے، جب تک نہ بھولو گے لوگوں کی خوش دلی اور مرحومہ باقی رہے گا۔ یہ لورہ پانی ہو۔ سب کچھ ملل کا دیا ہوتا ہے۔ اور ہاں یہ لینا۔ یہ ہم ... کے باپ نے دیا تھا۔ کتنا ہے اس کے باغ کے درخت کا پھل اچل ہے۔ جب تک میں یہ کچھ لوں گا کسی اور کو نہ ملے گا۔ اس میں کتنا راجھی بن چھپتا ہے۔ یہ ہمارے ہمارا کام ہے۔

اتنے میں فتح پور آگیا، کہنے لگے جادو، اٹاؤ پر پھر ملنا پاتے پی جلتے گی۔ مرحوم ہمیشہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ بڑے سامان و اہتمام کے ساتھ، سیٹ ہمیشہ ریزرو کر لیتے تھے۔ مرحوم اس زمانہ سے سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے جب سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا میں منزلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس سامان و اہتمام کے ساتھ آج کل میں اچھے اچھوں کو بھی فرسٹ کلاس یا سلون میں سفر کرتے نہیں پاتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی صاحب وقار سفر کرے گا۔ اس آسائش کی ہر چیز بڑھیا اور سفری، ہمسفروں کا رکھ رکھاؤ۔ لباس و اطوار میں معنائی اور خوش سلیقگی، جس سفر کرتے تھے صرف اسی کو پورا کر کے واپس آجاتے تھے۔ ایسا شاید کبھی متلا۔

ہو کہ جس خاص غرض سے سفر کیا ہو اس کے علاوہ بھی کچھ اور کر کے واپس آتے ہوں۔  
 مشکل سے سال بھر ہوتے ہوں گے۔ رات کا وقت تھا، باہر سو پڑا پر بیٹھے ہوتے تھے۔  
 کہنے لگے آج ختم سے ایک بات پوچھنا ہوں۔ یہ تو بتاؤ دل میں کبھی کوئی خطرہ بھی گزرتا رہے میں  
 نے کہا میں آپ کے سوال کی نوعیت نہ سمجھا۔ خطرو سے کیا مراد ہے۔ کہنے لگے مطلب یہ ہے  
 کہ ہر انسان کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہم سے یہ اچھا کام نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہم ایسا  
 کر سکتے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ تو جانتے ہیں میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن رہا  
 ہوں۔ مجھے ہمیشہ ہر نعمت حاصل رہی جس کی میں نے خواہش کی لیکن ایک بات البتہ ایسی ہے  
 جو اکثر مجھے کھٹکتی ہے، کہنے لگے، ہاں ہاں وہی بات پوچھنا ہوں۔

میں نے کہا آج علی گڑھ آئے ہو تو ۲۳-۲۴ سال ہوتے، گھر سے پہلے پل نکلا تو زندگی  
 کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور ہے پہلا زمانہ بڑی تنگ حالی کا تھا۔ اب خدا کے فضل سے ہر طرح کی  
 کامرانی اور فراوانی حاصل ہے۔ یہ بھی اللہ کا کچھ کم احسان نہیں ہے کہ ماں باپ بھائی بہن جو  
 آج سے ۲۳-۲۴ سال پہلے موجود تھے سو والدہ جوہر کے یقیناً سب بقیہ عیالت ہیں۔ اور میری  
 کامرانی سے خوش اور مطمئن۔ لیکن جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علی گڑھ کی زندگی۔ یہاں کی بہابی۔  
 بیوی بچے دوست اصحاب۔ وطن سے دوری اور اس فتنہ کی بہت سی باتوں نے کبھی اس کا  
 موقع ہی نہ دیا کہ ان لوگوں کا دھیان بھی آتا جو میری دولت، راحت اور عزت میں شریک  
 ہونے کا حق رکھتے تھے، مجھ پر بہتوں کے حقوق ہیں ان حقوق کو میں تصوراً بہت ادا کرنے کی  
 کوشش بھی کرنا ہوں لیکن دل گرا ہی دیتا ہے کہ جو کرنا چاہتے اس سے اعراض کرتا ہوں۔  
 بنیں اپنے اپنے گھر جا چکی ہیں، بھائی بھی بے سرکار ہیں۔ مل میں کوئی آرام سے بے سر کر رہا ہے  
 اور کوئی تنگی ترشی سے۔ والد صاحب گھر پر ہیں۔ کبھی کبھی وطن جاتا ہوں تو سب کو دیکھ لیا

آتا ہوں۔ والد صاحب آرام سے ملیں اور باوجود اس سپیدانہ سالی کے وہ اب بھی دوسروں سے خدمت لینے کی بجائے دوسروں ہی کو آرام پہنچاتے ملیں۔ میں جانا ہوں تو پچھوے نہیں سالتے اور اب بھی میرا جی خوش کرنے کے لئے اور اپنا بھی، وہی باتیں کرتے ملیں جو بچپن میں میرے لئے روارکھتے تھے۔ میں غصوڑے ہی عرصہ کے لئے ان سے ملنے جاتا ہوں اور جلد ہی واپس آ جاتا ہوں۔ عجیب معلوم ہے اگر میں ان سے ملنے کے لئے ذرا دیر اور ٹھہر جاؤں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہاء ہوگی۔ لیکن وہ یہ جانتے ملیں کہ میں بیوی بچوں میں جلد سے جلد واپس آ جانا یا وہ عزیز رکھتا ہوں۔ اس لئے اشارۃً کنایہً بھی کبھی اس کا اظہار نہیں کرتے کہ میں غصوڑے عرصہ کے لئے اور ٹھہر جاؤں۔

میں غصوڑی دہرے لئے رگ گیا اور بولا، مولینا آپ کے سوال نے دل کے مدافوں کے لٹے ہوئے سوتے کھول دئے، ایسا تو نہیں کہ آپ آتے نے مجھے ہوں۔ علی گڑھ میں اس قسم کے خیالات شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ آپ نے نہیں معلوم، دل کے کون سے تار کو جنبش دے دی۔ کہ اس وقت طبیعت بے قابو ہو گئی۔ اس گفتگو کو ہمیں کیوں نہ ختم کر دوں۔ مرحوم ہر اس وقت ایک استغراقی کیفیت طاری تھی۔ چونک پڑے۔ کہا نہیں نہیں مجھے چلو۔ اب ختم کئے بغیر نہ کہنا۔ میں نے کتنا شروع کیا، سا اقصاء میں اس اندیشہ سے نہیں وہرا نا چاہتا۔ کہ نرونا ظہیرین کو ان سے کوئی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب تک وہ بائیں معلوم نہ ہوں مرحوم کے اس عمل و معنی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ جو میں یہاں بتانا چاہتا تھا۔ میری داستان کا خلاصہ یہ تھا کہ میری علی گڑھ کی زندگی اس زندگی سے بالکل مختلف ہو گئی تھی جو میں اپنے والدین اور اضرار کے ساتھ وطن میں بسر کر چکا تھا۔ اس زندگی میں جہاں میں گزشتہ آلام و مصائب کو معمول سمجھتا تھا۔ وہاں ان ذمہ داریوں کو بھی بڑے حد تک نظر انداز کر گیا جو اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے

مجھ پر حملہ ہوتی تھیں۔ وہ مجھ پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے دل و دماغ سے جتنا وہ ملول یا مسرور ہوتے ہیں اتنا ان کے دل و دماغ سے ملول اور محروم نہیں ہوتا۔ فراغت کی زندگی کی یہ محسوس اکثر میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

میں بزرگوں اور عزیزوں کے دل و دماغ میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے مسرت کے پیالہ کو جو بہت ہی اتھلا ہے اپنی قوس سے لبریز کر دوں لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نفس جیلے تلاش کرتا ہے تو میں اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہوں۔

مروم گروں جھکاتے ساری داستان سنا سکتے۔ میں خاموش ہو گیا تو ایک لغت چوہا سے پڑے، فرمایا، بڑی بات کہہ ڈالی۔ اللہ بخشنے والا ہے، خوب کسی، ٹھیک کسی، میرے دل کی بات کہہ دی، اللہ خوش رکھے، پھر اٹھ کر ٹھانے لگے، کمر پر ہاتھ باندھ کر سر نیچا کئے دیر تک ٹھلا کئے، غصہ بڑی عمدگی دیر بعد کہہ دیتے، ٹھیک کسی، بڑے پتے کی بات کسی، بڑی مہربان بات ہے۔ نئی بات کسی۔ مروم کی اس وقت عجیب حالت تھی، کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے عالم ہند طاری ہے۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے بہت مسرور و مطمئن ہیں۔ دیر تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر میں کہا اس وقت جاؤ پھر کبھی اس پر فصل بحث ہوگی۔

مروم کالج کے ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ رات کے وقت پہلی کچی بارکوں کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ اور آمدورفت کے لئے صرف وکٹوریہ گیٹ ہیں ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ جس پر دربان مقرر تھا۔ اور انے جانے والوں کے نام درج کئے لکھ لیتا۔ آدم جی پیر جی منزل (روڈ نمبر) کے دروازے جس میں مروم تمام عمر مقیم رہے مارٹین روڈ پر کھلتے تھے۔ مروم بڑی رات گئے تک بیدار رہتے لیکن یہ نامکمل تھا کہ کوئی طالب علم یا شخص آدم جی پیر بھائی منزل کے دروازے سے سید محمد کو روٹ میں آجائے۔ مسجد سے عشاء کی نماز پڑھ

کہ واپس آتے۔ اور کچھ لوگ ساتھ بہتے (مروم) ان کو کبھی اپنی موت سے باہر نکلنے نہ دیتے۔  
 ہمیشہ یہ کہہ کر واپس کر دیتے کہ وکٹوریہ گیٹ سے باہر جاؤ۔ اس میں طلباء یا غیر طلباء کی  
 کوئی تخصیص نہ تھی۔ اس پر طلباء یا دوسرے لوگوں سے کبھی کبھی ہرزگی بھی ہوتی لیکن  
 مروم نے اپنے اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا۔

کم و بیش تیس سال تک دو منزلہ میں مقیم رہے۔ اگر مروم علی گڑھ میں موجود ہوتے تو  
 دو منزلہ میں مروم کا موجود ہونا بھی یقینی تھا۔ برخلاف دوسرے لوگوں کے یہ ناممکن تھا کہ مروم  
 محض نظریہ یا احلاق کہیں اور ملنے ملانے چلے گئے ہوں ہمیشہ اپنے ستھرے پلے سوا اس  
 کے کہ کہیں شادی یا غمی کی تقریب ہو یا یونیورسٹی کے کام سے واپس چاند یا پودا اس چاندل  
 نے طلب کیا ہو یا اپنوں میں سے کوئی بہت بیمار ہو۔ بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو کہ مروم  
 نے سوئمٹنگ ہائٹھ نہیں دیکھا تھا۔ کتنے غمے ادھر جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ یہ بات  
 میں نے بہت کم لوگوں میں پائی۔

یونیورسٹی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمد پر جشن بھیلے ہوا کرتے تھے۔ مروم ان میں کبھی  
 نہیں شریک ہوتے۔ اس پر اکثر تجویز گئیں بھی پڑیں لیکن مروم اپنی عکب سے ذرا ادھر ادھر  
 نہ ہوتے۔ کہتے تھے یونیورسٹی میں دولت و امارت کا کیا بیج۔ ایسے لوگوں کے لئے سلامی ٹیبا  
 پڑی ہے وہیں بیڑھو ٹنگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں علم و فضل دیکھا جاتا ہے۔ کوئی حساب  
 فضل و کمال آتے تو البتہ!

ایک بار کوئی میٹنگ تھی جس میں گفتگو تیز تیز ہوتی شروع ہوئی۔ ایسے موقع پر مروم  
 کب تاہو میں رہنے دے تھے۔ بعض لوگوں نے جو قریب ہی بیٹھے تھے مولینا کو با یا کہ خالص  
 مہربانا بھی مصلحت ہے مروم نے چپک کر کہا۔ غاموش کیسے ہو باتوں و سلسلے کو لپیٹیں



نہیں دیا بارہا جتنے علم و ایمان کے مسائل ہیں۔ خیال فرماتے ہو نہ۔ علم و ایمان کی آزمائش ہے۔ نیاز مندی یا اطاعت شعاری کی نمائش نہیں ہے۔ میٹنگ سے واپس آنے کے بعد مجھ سے فرمایا اور کہیں جی یہ تم بیٹی بلی بنے کیسے بیٹھے رہے۔ میں نے کہا مولینا بخش ٹری ہی سی کس رہائی تھی۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ بیٹی بلی گر رہا جو بن جاتی۔ بڑے زور سے سننے پھر فرمایا لیکن رہتے بلی ہی۔

مروم مذہبی معتقدات میں بڑا نلور کھتے تھے۔ اور اطہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا ان کا اعلان بھی کر دیا کرتے تھے۔ بابا ہر مختلف الجینال لوگوں سے بھی بقول ان کے کھانا کھلاتا تھا۔ خالقہ سلیمانہ کے مقربین میں محمد اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا ابو بکر صاحب، محمد معتدی خاں شروانی، نواب مدد یار جنگ بہادر، سید زین الدین صاحب تھے۔ باہر دلول میں سے مولوی ابوالحسن صاحب، سید بار الدین صاحب کو یہ اعتنا حاصل تھا۔ مولینا ابو بکر صاحب کے بڑے مداح تھے۔ ایک دن کہنے لگے جب یونیورسٹی میں ان کا تفسیر ہو رہا تھا تو میں کچھ تذبذب میں تھا۔ تم تو مانتے ہو ان کا مسلک میرے مسلک سے بدلہ ہے، میں سمجھتا تھا شاید میرا ان کا نباہ نہ ہو سکے لیکن یہ آدمی تو بے نظیر نکلا۔ مولینا ابو بکر صاحب کو سڑکی تک کھینچ ہوئی۔ اور علالت کسی قدر تشویشناک حد تک اختیار کرنے لگی تو ایک دن بڑی بقراری سے فرمایا اللہ شفا دے یونیورسٹی کیا دور دور ایسا آدمی نہ ملے گا۔ علوم پر بڑی اچھی نظر ہے۔ بڑی گہری نظر ہے، حاضر علم ہے۔ بڑی متوازن شخصیت ہے۔ نہ عجب کھانا ہے نہ عجب ڈانٹ ہے۔ یہ بات مردوں میں ناپید ہے۔ پھر یار دل کا بار ہے۔ کہتے کہتے ایسا معلوم ہوتا جیسے طبیعت میں لگدگی پیدا ہو گئی۔ کہنے لگے عجیب آدمی ہیں۔ کوئی کام ہو کسی کا کام ہو۔ کسی سے ہو یا اپنی رد مال کندھے پر ڈالا اور ڈنڈا سنبھال کر گھر سے

نکل پڑے۔ فیضِ فرض کو فرض سمجھ کر نہیں پورا کرتا بلکہ اس کے ادا کرنے میں لطف اٹھاتا ہے۔ آج محل دیکھو کس کرب میں مبتلا ہیں۔ یہی کن معمولات میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ بات چیت کرنے میں کوئی تردد یا محال کتنوں کی ان کے دم سے پردیش ہے۔ ہاتھ کھلا، دل غنی۔ ہزار ہا آدمی ہیں: ذاکر صاحب سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا چلتے مولینا سے مل آئیں۔ ہم جیسے بچے مرحوم استنجا کرنے جا رہے تھے۔ میں پہلے کمرہ میں داخل ہوا کھنے لگے۔ اتھو یہ سواری باد بہاری کہاں سے آئی۔ اچھا بیٹھ جاؤ استنجا کر آؤں۔ فوراً ہی ذاکر صاحب کمرہ میں داخل ہوتے۔ دیکھتے ہی مسرت سے چہرہ بگڑ گا اٹھا۔ ایک خاص اندازِ ترنم سے بولے، اہو ہو ہو، ذاکر ٹم کہاں؟ اہلا سہلا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا سرمدہ سے سامنے ہیں ہوا تھا۔ آج ارادہ کر لیا کہ ضرور جواب دل گا، بولے جزاک اللہ! جزاک اللہ! میری طرف جواب ہو کر برے۔ خدا خوش رکھے انہیں خوب لائے، خوب لائے۔ لوٹا زمین پر رکھ دیا۔ میں نے کہا استنجا سے فارغ ہو آئیے۔ کہنے لگے نہیں اب نہیں۔ ٹاکر سے بات ہوگی۔ اب سب کام ملتوی۔ یہ کہہ کر تخت پر جا کر دو زانو بیٹھ گئے۔ تخت پر مولینا کم بیٹھتے تھے کوئی مہوتا یا آتما مرحوم معمولاً اپنی آفس کرسی پر گول میسر کے سامنے دونوں پاؤں اٹھائے بیٹھے۔ بچے یا بیٹھتے تخت پر دو زانو بیٹھنا خاص ہی خاص مواقع پر ہوتا۔ جب طبیعت نہایت شگفتہ ہوتی تو تخت پر جاتے اور دو زانو بیٹھتے۔ یہ انہیں کا فقرہ ہے کہ اب اجلاس تخت پر ہوگا۔ اس کے یہی معنی تھے کہ لطفِ محبت میں کسی قسم کا عمل ہونے نہ دیا جائے گا اور صحبت پورے طے پر گرم ہوگی۔ چار تیار کی گئی۔ شفاف سبزی مائل چائے سبزی خوشبو سے معطر، ٹھوڑی شکر ملی ہوتی بغیر دودھ کے خوش نما بلوری فنجان میں اس ورمیل میں کوئی دوسرے درجہ کا آدمی آجاتا تو اسے فوراً رخصت کر دیتے اور فوراً کہہ دیتے اس وقت

جاؤ پھر کبھی آنا۔

اُس دن بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، بڑے لطف کی باتیں بڑے محبت کی باتیں اور بڑے چٹے کی باتیں۔

میں نے بہت کم لوگوں کو مرحوم جیسی پُر لطف باتیں کہتے سنا ہے۔ محفل لطائف یا فقروں کی کمی نہ تھی۔ لطیفہ خواہ وہ کیسے ہی ہوں بے مضطر زبان کہتے تھے۔ ان کی زبان پر بعض غیر نقد فقرے بھی بڑے مزہ کے معلوم ہوتے تھے۔ میرا ان کا بڑے عرصہ تک ساتھ رہا ہے۔ میں نے ان کو شاید ہی کبھی ایک ہی لطیفہ یا فقرہ دہرائے سنا۔ میں ایسوں سے بھی واقف ہوں جو بڑے لسان اور طرار سمجھے جاتے ہیں لیکن دو چار محبتوں کے بعد اکثر ہی معلوم ہوا کہ فقرے اور لطیفے رٹے ہوئے ہیں جو موقع بے موقع دہرائے جاتے ہیں، بر محفل اور اچھوتا فقرہ چست کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ مرحوم کو اس میں خاص درک تھا۔

میں نے انیس جلال کے عالم میں بھی پایا ہے۔ علم و ادب پر گفتگو کرتے کرتے اکثر جلال میں اہمیت۔ لیکن اس بات کی شان ہی کچھ اور ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ علم یا ادب کے بل پر یا ان کے ناموس کی حفاظت میں آمادہ ہوا وہیں تجویز یا تجویز کا شاہد تک پہنچتا۔ لیکن جب بے تکلف دوستوں کے حلقہ میں ہوتے تو ان کی باتوں میں گفتگو کی نیچرینی و زیبائی ہوتی۔ مرحوم یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں

”عجم کا حسن طبعیت، عرب کا سوز و رول“

کا نقشہ ہی پھر جاتا ہے۔

مرحوم کے بڑے بھائی کا انتقال مرحوم کی رحلت سے کوئی دیر۔ ایراپٹے علی گڑھ میں ہوا۔ بڑے بھائی نہیں مرحوم بھائی بہان یا بھیا کہتے تھے، مدقوں سے جنون میں تھے، بولنا

بالکل ترک کر دیا تھا۔ چڑب چاپ اور اُدھر اُدھر مچھرتے تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تعلق نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے لئے تکلیف دہ تھے۔ مولانا مرحوم، بڑے بھائی سے اس سال میں عینی محبت کرتے تھے اور ان کے راحت کی جزئیات پر عیسیٰ ان کی نظر تھی اس کی مثال شاید سی کمپس مل سکے۔ سیکنڈ کلاس میں انہیں ساتھ رکھتے تھے۔ دسترخوان پر محزون سے محزون ہمان کیوں نہ مہوتا بڑے بھائی ضرور بلائے جاتے۔ بڑے بھائی جس طرح جس کھانے کو کھانا چاہتے کھاتے۔ ان کے لئے مہروی گرمی کا لباس بڑی محبت اور تکلف سے منواتے۔ بھائی جان، ہی کے لئے اوم جی پیر بھائی منزل کی شمالی سمت ایک اساطیر دیا تھا۔ جس میں ہر طرح کے پھول کے درخت لگوا دئے تھے۔ برآمدہ میں پھولوں کے گلے بنے۔ بھائی بیمار ہوئے تو مرحوم سے پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مریض اپنا سال نہیں بتا سکتا تھا۔ معدہ کی تکلیف تھی حکیم صاحب محلج تھے۔ ان کی مشعل یہ تھی کہ معدہ کو آلائشوں سے پاک کرنے کا جو طریقہ مناسب ہو سکتا تھا۔ مثلاً عمل دنیا اسے مولانا مرحوم برتنے نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے جعبانے جو بات تمام عمر گوارا نہ کی اسے آخر وقت میں کیسے ہونے والی۔ معلوم نہیں وہ کس عالم میں تھے۔ ان کے دل پہ کیا گزرے گی۔ بول براؤ کا اٹھان با ان کے اخراج کا طریقہ یا ان کے متعلقات پر گفتگو کرنا خود مولانا مرحوم بالکل انہیں پسند کرتے تھے۔ بھائی کی بیماری میں مرحوم کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے، پہننے اور چھنے، سونے، بیٹھنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ لباس میں خطا پڑھا، اوقات مقررہ میں کھڑا ہو کر گفتگو میں نہ لہوئی کہنے نہ تھے۔ اس لئے اپنے سلطانیت چھوڑ دئے ہیں۔ حکیم صاحب نے نہایت محبت، جوشیلا اور جانفشانی سے علاج کیا۔ نہ دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، ادویات، اشہب، جوہریت اور دیگر ضروری چیزیں گھر سے تیار کر کے بھیجتے۔ ضروری مشاغل سے فرصت پا کر مریض

ساحہ صبح چوتھہ صبحہ لطیف سارب لکھنوی داس پر پهل طیبہ کا لعلی گڑھا

کے پاس آجاتے ہر طرح کے عقبن کئے گئے لیکن ایک پیش نہ گئی اور بھائی جان مولانا مرحوم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد ایک دن مرحوم خود بخود فرمانے لگے رشید! معلوم ہوتا ہے کہ میری غیر بھی علی گڑھ ہی کی ہے۔ پہلے اکثر خیال آیا کہ اچھے بڑے دن سبھی دیکھ لئے اب فیور سٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اور وطن جہاں بزرگوں کی یادیں بقیۃ زندگی بسر کروں۔ علی گڑھ میں زمین بھی مل سکتی تھی، کبھی یہ خیال آتا تھا کہ یہیں مکان بنواؤں اور واپسوں۔ بھیتا زندہ تھے۔ تو یہ سب خیال آتے تھے وہ چل دتے۔ بہت سی ذمہ داریاں ختم ہو لیں تو بعض کمزوریاں بڑھ گئیں۔ اب ٹھکان لی ہے کہ بھیتا ہی کے قدموں میں جا بیوں۔ خلا سید زین الدین کا بھلا کرے۔ انہوں نے اپنے قبرستان میں ٹھوڑی سی جگہ دے دی ہے۔ اب کہیں نہ جانا پڑا۔ ہاں ذمہ داری ختم ہو جاتے تو کمزوری سے مغلوب ہو جاتا کوئی مصداقہ کی بات نہیں۔

مرحوم کی زندگی کچھ عرصہ سے خراب چلی آتی تھی۔ بڑے بھائی کی وفات کے بعد اس میں بے چین مچھال پیدا ہو گیا تھا۔ پچھلے رمضان میں بخار آیا، معالج کے اصرار کے باوجود رونے لگنے سے باز نہ آئے لیکن سبب طبیعت زیادہ مڑھال ہونے لگی تو روزے ترک کر گئے۔ مرض نے طوالت پکڑ لی لیکن کچھ عرصہ بعد افاتہ کی صورت پیدا ہوئی۔ جس بہت دنوں سے حاضر نہیں ہوا تھا۔ ایک دن کانٹ سے واپسی پر دہاں گیا تو سونے کے کمرہ میں علیحدہ دروازہ کے پاس ہی ایک معوفہ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ کمزوری مزید تھی۔ لیکن تپ رہا روشن تھا، گفتگو آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ لیکن آواز میں تنگی نہ تھی۔ دیر تک بات کرتے رہے جس میں ہوس یا مایوسی کا شائبہ نہ تھا۔ کہنے لگے رشید جو کچھ تھا ہوتا ہو مرنے والا ہے۔ وہ ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ تھرا نہ سچا ہوا بے نظیر آدمی رہے۔ خدا اسے بخش رکھے کیا کوئی عزیز کرے گا جو اس نے کیا۔ ایسے لوگ اب

کہاں۔ بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ صاحب فن کی شخصیت ہے میں نے اُسے گہرا تے نہیں دیکھا۔  
 محبت کی وجہ سے الہتہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ نور جان ہے نا۔ مگر گزرنے پر یہ بات جانی چہ ہے گی۔  
 مرحوم کی وفات کے بعد ایک دن حکیم صاحب سے گفتگو ہوتی تو وہ بھی تعجب کرتے  
 تھے کہ ایسے پختے عقیدہ کا مریض انہوں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ کہتے تھے مرحوم کے مزاج  
 کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اُن کا علاج اُس وقت تک کوئی کر ہی نہ سکتا تھا جب تک  
 کہ ان کے اعضا تھے رقیہ کی عجیب و غریب دوا اوقات متناوبہ دوا دوا بلکہ دوا دوا کی کیفیت  
 سے پورے طور پر آشنا نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ ادویات تجویز کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔  
 کہ کون سی دوا کس حد تک مفید ہوگی۔ اور کہاں پہنچ کر وہ مرحوم کے مزاج سے بے اہم تک ہو  
 جائے گی۔ جب مرض کی شدت غالب آنے لگتی ہے تو اکثر طبیب کی طبیعت شددی متاثر ہو جاتی ہے  
 کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہونا ہے کہ مضبوط دوا اور طریق علاج سے ہٹ کر  
 بعض کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ دواؤں سے اعضا پر کوئی رد عمل نہ  
 ہوتا تھا اور نفوٹا بہت ہونا بھی تھا تو نقصان کی طرف ہوتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ محسوس کر کے کہ ممکن ہے مرحوم میں لحاظ کر کے کچھ نہ  
 کہتے ہوں۔ ایک دن میں نے دبی زبان سے یہ کہہ دیا کہ مولین اب معالج بدل کر دیکھا جائے۔  
 کیا ہوتا ہے ممکن ہے مرض میری سمجھ میں نہ آتا ہو یا میری نظائیر کا گزرنے ہوتی ہوں۔ حکیم صاحب  
 کہتے تھے مولینا پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی، کہنے لگے حکیم یہ سمجھتے ہو گے کہ مولوی مر گیا۔  
 تو لوگ کہیں نے کہ حکیم صاحب کے علاج سے مر۔ خبردار خبردار مت گھبرانا علاج تمہارا ہی رہ گیا۔  
 مارنا سبلا نا تمہارا کام نہیں ہے یہ تو کوئی اور کرتا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ علاج کئے جاؤ بہت  
 ٹھیک علاج کر رہے ہو۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا کہ علاج کیسا ہو رہا ہے۔ علاج ختم

تک نہیں بدلا ہائے بکا۔ سمجھنا؟ ہاں!

ہر شخص نے حتیٰ کہ مولانا مرحوم کے ایسے دوستوں نے جن کو وہ نہایت محترم و عزیز رکھتے تھے اصرار کیا کہ علاج بدل دیا جائے۔ مرحوم نہ مانے اور ہمیشہ یہ کہتے رہے ختم لوگ میرے حکیم کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑے معرکہ کا علاج کر رہا ہوں۔ میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں۔ جو حکیم صاب فرماتے تھے کہ مولینا نے ایک بار فرمایا تھا کہ حکیم اب کے تو جانبر ہو گیا۔ اب بخار آیا تو پھر نہ اترے گا۔ اور ایسا ہی ہوتا۔

پچھلی عید میں مرحوم نے مسجد میں ناز پڑھی۔ کروڑ ہو چکے تھے۔ میرا اور بعض دوستوں کا مدت سے یہ معمول چلا آتا تھا کہ مسجد سے واپسی پر سب سے پہلے دو منزلہ آتے اور مرحوم سے مل کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ گزشتہ عید کے موقع پر پہنچا تو مرحوم ملاقات کے کہہ میں اجاب و عقیدت مندوں کے ہجوم میں کھڑے تھے۔ اسی وقت مسجد سے واپس آتے تھے۔ تھکن سی محسوس کر رہے تھے۔ فرمایا بھائی معاف سے صاف کرو، دم لینے کرسی پر بیٹھ گئے اور صاف کرنے لگے۔ میں پہنچا تو آنکھ کر بغل گیر ہوتے۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا اور اپنے لمبے چوڑے سرخ ٹیچے دار رو مل سے پیشانی سے بار بار پسینہ پونچھتے تھے لیکن چہرہ پر نشاطت مٹی اور آواز میں کراہن، مرحوم آواز کے لئے اکثر یہ لفظ (کراہن) استعمال کرتے تھے۔

ماہ میام آ رہا ہے۔ عید بھی آئے گی۔ اس وقت جب کہ یہ سطر میں لکھ رہا ہوں رمضان کے کچھ بیٹھے اور عید کی کتنی تقریبیں یاد آرہی ہیں۔ تراویح کے بعد مرحوم کے ہاں کی وہ محبتیں جب چائے کا قدر ہوتا تھا۔ مخلصین کا مجمع، لطف کی باتیں، مرحوم کی باتوں میں وقت کتنا جلد جلد گزرتا تھا۔ جو کوئی آتا اس پر محبت کا کوئی فقرہ چھپتے نہ دے۔ چائے کی پہلی

پیش کی جاتی۔ کسی کے علیہ پر کوئی فقرہ کہہ دیتے جتنی کے لباس کی تعریف کر دیتے سی لی اور زاری کی داد دیتے۔ کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر کسی کی رائے لکھتے اور مذاق ہی مذاق میں اس کے بعض نازک پہلو اس طور پر بیان کر جاتے۔ گویا وہ بات بھی اس صحبت کی تفریحی گفتگو کا ایک جزو تھی۔ عید کی نماز سے واپسی پر حلقہ احباب گرم ہوتا۔ چائے عطر و پان سے ہر ایک کی تواضع کی جاتی۔ ہر شخص کے مذاق کو قدر نظر رکھ کر اس سے پرسش احوال کرتے۔ کالج پالٹیکس پر کبھی مجمع میں اظہار خیال نہ کرتے اور نہ کسی کو اس قسم کے مسائل چھیڑنے کی ہمت ہوتی۔

دوسری بار مرموم طویل ہوئے تو روز بروز حالت گئی ہی گئی۔ اس دوران میں عرصہ تک میں حاضر نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے پر ہمیشہ یہی معلوم ہوا کہ کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور مرض قابلِ توجہ نہیں آ رہا ہے۔ اس حالت میں مرموم کو دیکھ نہ سکتا۔ جس شخص کو تندرستی، زندگی، استقلال و استقامت کا جیتا جاگتا نمونہ دیکھ کر کا تھا۔ اسے بے بس و ناتوان دیکھنا میرے بس کا نہ تھا۔ ایک دن مکان پر ایک اہم کام میں مصروف اور پروانس چانسٹر صاحب کے خط کا منتظر تھا۔ کہ نوکر نے آکر خبر دی کہ مولینا صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ علیم صاحب اور دوسرے لوگ وہیں گئے ہوتے ہیں۔ زبان سے بے ساختہ آٹالینڈ نکلا۔ گرتا پڑتا دو منزل پہنچا۔ ہجوم دیکھ کر دل ٹھیک گیا۔ کمرہ میں سب لوگ جمع تھے۔ کئی ڈاکٹر بھی بلا لئے گئے تھے۔ مشورہ ہو رہا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ غفلت طاری رہنے لگی ہے۔ کبھی کبھی ہوش میں آ جاتے ہیں۔ علاج بد لکھے پر اب بھی تیار نہیں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کچھ ہونے والا ہے اُسے اب کوئی مثال نہیں سکتا۔ علاج بدلنا نہ بلانا دو نوہرا ہے۔ دل البتہ نہیں مانتا۔ شاید ڈاکٹر علاج سے نقشہ بدل جاتے۔ فوایب صدر یار جو بنگ بہادر جو مرموم کے سب سے بڑے مقرب و محترم تھے اندر ڈش لیتے گئے۔ میری باب بھی ہمت نہ ہوتی کہ اللہ بآتا مرموم کی حالت



غیر ہوجی تھی لیکن پہلے حکیم صاحب کو دیکھا حکیم ختم بھی پا جاتے ہو کہ علاج بدل دیا جاتے۔ حکیم صاحب نے کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر جرح ہو کر و۔

یہ ہو چکا تو دل کوڑا لٹکے میں بھی حاضر ہوا۔ کسی نے میرا نام لے کر باوا بلند کہا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ مرموم نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مرموم نے مجھے دیکھ کر سچا نا ہو۔ مرموم نے میں سے ایک صاحب نے پھر یاد دلایا کہ فلاں آیا ہوا ہے۔ نہایت نحیف آواز میں فرمایا۔

آب آتے ہو۔۔۔۔۔ بڑی دیر کر دی" اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ ذری ہی دیر میں پھر ہوشیار ہوئے فرمایا یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہی تین فقرے تھے جو میں نے سنے۔

کچھ دیر تک میں کمرہ میں مرموم کی چارپاتی سے لگا بیٹھا رہا۔ موت کا تقصیر کبھی کبھی ماضی کے معدنے فتنوں کو بہت زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ انا نمایاں گویا ان میں انفسر نو زندگی ڈال دی گئی ہے۔ مجھے پچھلا زمانہ ایک ایک کر سہ یاد آنے لگا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اٹھاسال قبل میں رہ چکا تھا۔ مرموم نے ایک دن اس زمانہ میں مجھ سے فرمایا کہ اس مہارت کے دو حصے ہیں تم و تم آباؤ ہیں۔ میرے لئے موجود حصہ نا کافی ثابت ہو رہا ہے۔ بھائی جان کو بھی تکلیف ہے۔ اگر حصہ بھی مل جائے تو تم لوگوں کے لئے بڑی آسانی ہو جائی۔ میں اسٹاف میں آ گیا تھا۔ اس لئے بڑی آسانی سے مجھے اور کمرے مل گئے اور میں وہاں سے خدمت ہو گیا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آرہا تھا۔ اس کمرہ میں معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ بانیں یاد آنے لگیں ہیں۔ زندگی کے جتن بڑے دلکش نشیب و فراز وابستہ تھے۔ اپنے ہی نہیں مرموم کے بھی۔ ان کے دھرانے سے کیا حاصل۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں مرموم بڑے شوق سے آئے تھے۔ اس میں ان کے شوق کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہیں وہ بے تکلف اور مخلص احباب سے بڑے شوق سے ملتے تھے۔ اور — یہیں سے وہ آج ہر شوق سے خدمت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو

دوسروں کے لئے سہارا تھا۔ ہر سہارا سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جبن میں زندگی  
مخلوس اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں۔ جس سرچشمہ سے میں اور لکھنے اور تعویذ  
اور دشا سنت حاصل کیا کرتے تھے وہ خشک ہو رہا تھا ہمیشہ کے لئے خشک!

میں بڑھیا رہا۔ مرحوم کی حالت دیکھ کر طبیعت بے اختیار ہونے لگی۔ جی پامنا کاش  
مولانا ایک غزل تندرست ہو کر بیٹھ جاتے اور کہتے "خوب آتے بیٹھو گپ ہوگی۔ کدو اب بڑا  
ہو گیا۔ ناچے گا نہیں۔ پان کھاؤ۔ ایک مجھے بھی دینا" میری وہ حالت تھی جب آدمی دماغ  
مانگتا۔ شاید مانگ بھی نہیں سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ دعا مانگنا جھٹ ہے۔ وہ صرف یہ چاہتا  
ہے کہ ہر چیز دیگر گوں ہو جائے۔ ناممکن ممکن ہو جائے۔ یہ خواہش دعا مانگنے سے بھی زیادہ  
عجیب ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہ بات جتنی ناممکن ہے اتنی ہی فطری بھی معلوم ہوتی ہے۔  
میں پیدا آیا اور پھر نکلا۔ دو دن بعد مولانا سلیمان اشرف صاحب انتقال  
ہو گیا!!

اور اللہ نے اپنے بہادر کو ہم میں سے اٹھا لیا!

سنا زہ کے حرم میں قبرستان پہنچا۔ قبرستان سے متصل میدان میں سنا زہ کے لئے جنازہ  
رکھ دیا گیا اور ان لوگوں کا انتظار کیا جانے لگا جو دفن میں شریک ہونے کے لئے دوڑتے  
بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ نماز پڑھانے کا صوب سے زیادہ حق فواید صدر بابا بنگاہ اور  
کو پہنچتا تھا۔ اچانک علالت کے سبب سے موصوف نشر لیف نہ لاسکے۔ مولانا ابوبکر صاحب  
منہ کے زخم رسنے کے سبب سے معذور تھے۔ چنانچہ مولانا شفیق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔  
اس وقت جب کہ نماز جنازہ کا سلسلہ زیر غور تھا مجھے مرحوم کی ایک بات یاد آتی جو وہ ہوتا ہوا لیتا  
نے مجھ سے ایک بار فرمایا تھا دیکھو دنیا کے پرچہ میں جو نماز جنازہ کا سوال میں ہمیشہ رکھ

دیتا ہوں۔ اس کا سبب جانتے ہو۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ ہر مسلمان جو اپنے مرحوم بھائی کے ساتھ آخری سلوک کر سکتا ہے وہ نماز جنازہ ہے۔ میں مرنے لگوں گا تو مجھے یہ تو اطمینان دے گا کہ میرا ہی کوئی عزیز طالب علم میری نماز جنازہ پڑھائے گا !

اس وقت جب کہ یہ نہیں طے ہو رہا تھا کہ نماز جنازہ کون پڑھائے۔ مجھے مرحوم کی بات بے اختیار یاد آئی اور یہی جی چاہا کہ مرحوم ہی کا کوئی شاگرد نماز پڑھائے۔ کاش میں ہی پڑھا سکتا۔ لیکن توفیق نہ ہوتی تو بس اتنی کہ جس جگہ مجھے نماز جنازہ پڑھانی چاہیے تھی۔ وہیں تحریت کا ریزولوشن پڑھ کر گھر واپس آ گیا اور نماز جنازہ کا بدل تحریت کا ریزولوشن رہ گیا !

# مولینا ابوبکر صاحبِ حرم

مرگِ مجنوں پر عقلِ گم ہے میر  
کیا دوانے نے موت پاتی ہے؟

مولینا الحاج ابوبکر محمد شیدت فاروقی جو پوری ناظم و بنیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ  
اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ نہ دعائیں مقبول ہوئیں نہ دعاؤں کا گز۔ وقت ٹلتا رہا۔  
لیکن انجام دہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دلی تمنا تھی کہ یہ نہ ہوتا لیکن شیت الہی کو کون سمجھ یا  
نال سکا ہے!

آہ وہ زندانیِ تقدیر (انسان) جسے بانیِ تقدیر بھی کھتے ہیں!

مولینا میرے ہم وطن تھے۔ کیا بتاؤں کہ میں ان کو کب سے جانتا ہوں۔ ان کی شخصی  
خوبیوں کو مجھے خود بخود چھٹا۔ ان کے بزرگوں کی برگزیدگی اپنے بزرگوں سے سُنی رکتا ہوں میں  
پر مہی اور دلوں میں پائی۔ ابتدائی باتیں تو حافظہ کے وقور و راز افش پر کسی پرندہ کی مہموم  
پر دلاڑ کی مانند گم ہو جاتی جا رہی ہیں۔ اب ان کو کون واپس بلائے، گس دل سے بلائے  
اور بلائے سے حاصل ہی کیا!

علی گڑھ نے کسی کام کا نہ رکھا، اُس نے اپنا بنا لیا، یہ بڑا ہی سخت گیر اور تنکی محبوب بنے  
نہیں چاہتا کہ اُس کے ادنیٰ مطالبات سے گریز کیا جاتے۔ یا اس کے سوا کسی اور سے  
التفات کیا جاتے۔ اس نے مجھے میری نظر میں محترم کر دیا۔ اس قید سے خلعی کہاں۔  
بہت سی باتوں میں اب نہ علی گڑھ سے بہتر و برتر مجھے مقام نظر آتا ہے اور نہ علی گڑھ اول  
سے بہتر و برتر لوگ۔ جب کسی اچھے آدمی سے ملاقات ہوتی ہے تو معاملہ میں سوال پیدا  
ہوتا ہے۔ یہ علی گڑھ کا ہے یا نہیں؟ نہیں ہوتا تو افسوس ہوتا ہے کہ ایسا اچھا آدمی  
علی گڑھ کے فیضان سے محروم رہا اور جب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کا ہے تو فخر سے گردن  
اونچی اور سرست سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ دل کا ایسا راز تھا جس کی تفصیل  
اُسے آتی ہے۔

پندرہ سو سال ہوئے یونیورسٹی میں اعظم دینیات کی جگہ خالی ہوئی میرے ذہن میں یک لحظ  
یہ بات آئی۔ کہ مولینا ایسا آجائیں تو خوب ہو۔ حسن اتفاق سے جلد ہی جانے کا موقع ملا۔ مولینا سے  
استمراج کیا۔ اب تک یاد ہے مولینا ایک کھتری چار پائی پر لیٹے ہوئے بستر پر رکھے جیسے عالم  
شوق میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے۔ میں نے پہنچ کر سلام کیا تو علیکم اس لطف سے کہا جس سے

محسوس ہوتا کہ میرے آنے کی مولینا کو بڑی خوشی ہوئی اور سلام کا یہ جواب ایک طویل اور پُر نالوں صحبت کی دعوت ہے۔ ہر ملنے والے سے خواہ وہ اجنبی اور فوارہ دہی کیوں نہ ہو مولینا کا یہی انداز پذیرائی تھا۔ خود اٹھ بیٹھے اور مجھے بھی اپنی ہی پار پائی پر بٹھالیا۔ اپنے لیے رومال کو جو پاس ہی رکھا تھا اس طور پر گھسیٹتے اٹھایا کہ جس جگہ میں بیٹھنے والا تھا۔ اس کو جھاڑو پونچھ دینا مقصود تھا۔ قدیم زمانہ کے بزرگوں کا یہ خاص انداز تھا۔ بولے کو علی گڑھ کا کیا حال ہے۔ کب آتے؟ میں نے کہا مولینا ایک بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ بولے کو ضرور کہو، وہ ان کا استعدادی اور ولولہ سے اس طور پر بہترین تیار ہو جانا جیسے ضرورت ہو تو ہم لوگ آپ کو لے کر آئیں گے۔

میں نے کہا علی گڑھ میں ناظم دینیات کی جگہ خالی ہے۔ آپ قبول کر لیتے تو بڑا اچھا ہوتا۔ کہنے کی یوں ہمت نہیں پڑتی کہ آپ کا سیاسی مسلک اور ہے، علی گڑھ کا اور فرمایا، مسلک کی تو کوئی بات نہیں۔ مسلک تو ایک ہی ہے اور وہ مسلک ہے اسلام کا، میں نے کہا یہ تو میں سمجھتا ہوں لیکن یہ کون سمجھاتے اور سمجھے کہ کون سا مسلک کیا ہے۔ بولے سمجھنے سمجھانے سے کچھ نہیں ہوتا، کرنے دھرنے سے ہوتا ہے، صحیح اور سچا راستہ دریافت کر اور اس پر چلنے میں تو ممکن ہے محنت ہو لیکن صحیح اور سچا آدمی بڑی آسانی سے پہچان جاتا ہے۔ تنہا علی گڑھ مصالحوں کا شکار ہے، صلوات اللہ علیہ اچھی چیز ہے لیکن مصالحت پرستی تنہا کی جڑ ہے۔ کچھ دیر تک اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں، اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مولینا، تو پھر بسم اللہ علی گڑھ تشریف لے چلتے۔ وہاں آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ بولے کیا مضائقہ لیکن میں دوڑ دوڑ کر آؤں اور سفارش ہم پہنچانے کے سچے میں نہ پڑوں گا۔ میں نے کہا یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیتے ہیں تو صرف آپ کا عندیہ لینا چاہتا تھا۔

میں چلنے لگا تو بوسے دیکھے اس سلسلہ میں کوئی بات ایسی نہ کرنا جو تمہارے یا میرے شایان شان نہ ہو۔ میرا شمار کچھ بہت کھاتے پیتے لوگوں میں نہیں ہے لیکن روپیہ پیسہ کے علاوہ اللہ کا یا اللہ بزرگوں کا سپرد کیا ہوا اور بہت کچھ موجود ہے مجھے نہ نوکری کی خواہش ہے اور نہ ضرورت۔ تم کہتے ہو کہ علی گڑھ جلوں میں بھی سوچتا ہوں کہ کچھ دن یہ شغل بھی رہے تو کیا ہرج۔ علی گڑھ والوں کو قریب سے دیکھنے سمجھنے کا موقع ملے گا۔ پھر تم ہو، ایوب ہیں وغیرہ وغیرہ۔

یاد نہیں آتا کون لوگ اور موجود تھے کس نے کہا، اور کیوں، مولانا آپ کی اور مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کیسے نبھے گی، مولانا نے فرمایا، بھائی ٹھیک کہتے ہو، یہ بات میرے ذہن نہیں آتی تھی۔ میرے ان کے بعض امور میں اختلافات ضرور ہیں لیکن وہ جون پور میں مدتوں رہے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف بھی تو ہیں۔ میں یہ تو نہیں مانتا کہ علی گڑھ جا کر وہ کیا سے کیا ہو گئے۔ لیکن اتنا ضرور یقین ہے کہ وہ میری مخالفت نہ کریں گے۔

میں علی گڑھ واپس آ گیا۔ سب سے پہلے مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم سے ملا دیکھتے ہی بولے کہو پاکٹ میں کچھ ہے؟ اس سے مرحوم کا مطلب یہ ہوا، کوئی بیغ نہ دہن میں ہے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا، ایک بات آپ سے منوانے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ شاہاباش اچھے گھرنیہ دیباستے، اسے سلیمان اشرف سے بات منوانا، ختم ہو کر ہی نے ہر کیا ہو گا۔ میں نے کہا مولانا بھائی کسی نے نہیں۔ یہ آپ یقین فرمائیے، ہوت تو پھر ٹھیک ہے، خود ہی بیکے ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کہا مولانا یہ بیکے ہر گز نہ پر آپ اتنا زور نہیں دے رہے ہیں۔ میں خود ہر کیا گیا لیکن آیا تو آپ ہی کے پاس۔ یہ بھی کوئی بیکے میں نہ لکنا ہوا، مرحوم بڑے نور سے ہنسنے پھر فرمایا اچھا کھو، بارش بابا ہم بازی، ہاں ہم سمجھا، کہو کیا کہتے ہو۔ میں نے ناظم دینیات کے قفسہ کے سلسلہ میں مولانا ابو بکر صاحب کا نام لیا اور اس کے بعد ہی

اُن کے محاسن زبان پر لانا چاہتا تھا۔ کہ بولے، اچھا، اچھا، ذرا چپ نہ ہو جاؤ۔ مولوی ابوبکر سے میں ہانف ہوں، میرے اُن کے مسلک میں فرق ہے، تم کو یہ باتیں معلوم نہیں، لیکن وہ آدمی اونچے گھرانے کا ہے، پھر غور میں پڑ گئے، تھوڑی دیر تک ہاتھ پیچھے بازو سے ٹپکتے اور گنگناتے رہے۔ اس کے بعد بولے، اچھا جاؤ۔ مولوی حبیب الرحمن خلل سے مشورہ کر کے بتا دیں گا۔

کچھ ہی دن بعد مولانا بالافتق راستے نظم و نیات مقرر ہو گئے، پندرہ سال تک مولانا نے جس لطف و کسر دوی، وسیع النظری، انتظامی قابلیت اور عالمانہ رکھ رکھاؤ سے اس منصب کے فرائض انجام دے اس کی بغیر علی گڑھ کے محکمہ و نیات کی تاریخ میں میری آنکھ سے نہیں گزری۔ گو یہ ان کے فرائض منصبی میں نہ تھا لیکن پانچوں وقت کی نماز پابندی کے ساتھ خواہ کوئی اور کیسا بھی ہر دم ہو، یونیورسٹی میں تعطیل ہو یا نہ ہو مسجد میں پڑھتی۔ اس میں حتی الوسع کبھی ناغہ نہیں کیا۔ و نیات کی لائبریری، از سر نو مرتب کی۔ و نیات کے نصاب پر نظر ثانی کی، مسجد اور متعلقہ عمارات کو مستحضر اور دیکھنے کے لائق بناتے رکھا۔ جتنے دارالافتاء یونیورسٹی اور اسکول سے متعلق تھے ان میں نماز پڑھنے بڑھانے کا باعث بظاہر نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی میں مذہبی و اخلاقی فضا پیدا کرنے میں انتہائی مخلص و تدریس سے کام لیا۔

مذہبی و اخلاقی وعظ، ایک، غیر مذہبی تفقیر ہے۔ مروجہ کہ نظر یہ اس بارہ میں سب سے علاوہ بیگانہ پڑے۔ طوطا، ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴



ساتھ یہ مسلمانوں کا بھی ادارہ ہے۔ اس لئے اس میں صرف انہماک رکھنا چاہئے کہ ہمارے طلباء اسلام کے اعلیٰ اقتدارات معاد و معاشرت سے آشنا رہیں اور علوم جدیدہ یا معاشرہ حاضرہ کی زد میں آکر اسلامی شعائر و اسلامی روایات سے بیگانہ نہ ہو جائیں۔ یونیورسٹی میں عبادت سے زیادہ اہمیت اور کو صحیح رکھنے کا الزام رکھنا چاہئے۔ اس کے بعد منزل یہ ہے کہ اعتقاد عمل کی کسوٹی پر کھڑا ثابت ہو۔ جس اعتقاد پر عمل کا بار ٹھیک نہ آئے وہ اعتقاد نہیں ذہنی نعیش یا گمراہی ہے۔ مسلمانوں کا عمل عبادت ہے عبادت عمل نہیں، یہاں یہ چیز ہمارے آپ کے عمل سے پیدا ہو سکتی ہے۔ قواعد کے شکنجوں یا تعزیرات کے خوف سے نہیں۔ مسلمان بننے پر مسلمان بنتے رہیں گے، قواعد قانون بدلتے رہیں گے۔

مروم کا سیاسی مسلک جمعیتہ العلماء کا تھا اور جہاں تک شعائر اسلامیہ کا تعلق تھا۔ وہ بدعات بشریہ کے سخت مخالف تھے۔ فاتحہ پیر پٹی اور اس قسم کی دوسری باتوں کے بالکل قائل نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کے وہ بڑے حامی تھے۔ تمام عمران کا لباس گزری گاڑھے کا رہا۔ سر پر عمامہ اور پاتل میں پنجابی جوتہ۔ صرف سخت سردیوں میں کوئی ہولی سا موزہ پہن لیتے۔

مجھے یاد آتا ہے ایک محبت میں جمعیتہ العلماء اور کانگریس کے سیاسی مسلک پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ مروم چوتھرہ پر اپنی خبا اور عمامہ سر کے نیچے رکھے ہوئے بیٹھ تھے۔ حاضرین میں سے کسی شخص نے جمعیتہ العلماء اور کانگریس دونوں سے بیزار تھا۔ جمعیتہ کے سیاسی مسلک پر نکتہ حسنی کی۔ مولانا اٹھ بیٹھے، کہنے لگے بھائی انصاف کرو اور مدد دے متجاوزہ ہو۔ علماء میں ہزار غیب بھی لیکن انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کی کوشش میں کچھ کم حقیقت نہیں

لیا ہے۔ آج کل لوگ زیادہ تر تقریر کرتے ہیں، تجویز پیش کر دیتے ہیں یا سنیا کرے ہیں شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے زمانہ میں جب حکومت کی مخالفت کرنا کچھ بہت زیادہ نقصان دہ تھا یا تکلیف دہ نہیں ہے۔ علمائے زمانہ نے اس وقت سے آزادی کا علم بلند کر رکھا ہے۔ جب ہندوستان میں آزادی کے نام سے بھی کوئی آئینہ نہ تھا اور آزادی و بغاوت ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے تھے۔ کانگریس کے نام تک سے کوئی واقف نہ تھا۔ علمائے پچاسی پر چڑھا دیتے تھے ان کے گھر ڈھاتے تھے۔ ان کو کھانا پانی بھیجا گیا۔ ان کے عورتوں بچوں پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے۔ ہم لوگ تو ہندوستان کی تاریخ سے واقف ہیں۔ کچھ بیچارے علمائے بھی تاریخ پر مبنی ہوئی۔ آج ہندو آزادی کے معاملہ میں اپنے آپ کو سب سے اونچا اور سب سے اگے سمجھتے ہیں۔ لیکن کوئی ہندو آزادی کے معاملہ میں علمائے آئینہ پر نہیں کر سکتا۔

مولانا نے اس سلسلہ میں ہندوستان کی تاریخ جہاد پر بڑی مسلسل اور دل نشیں تقریر کی۔ علمائے بہت سے تباہ شد، خاندانوں کا حال سُنا یا۔ جہاد پر بڑی نظائیں جب کبھی بھی گئی تھیں اور مذہب میں ان سب کو سُنا یا۔ جہاد کی تحریک جس طور پر شروع ہوئی، بولنگ شریک ہوئے اور ان کا جو کچھ انجام ہوا سب سُنا تے، پھر بولے دیکھو بڑا نہ ماننا۔ ہمارے مصالح یا ہندوئی کمزوری اپنی اپنی جگہ پر چاہے جیسی ہو مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں لیکن ایسا تو نہ کر دو کہ جن لوگوں نے ہندوستان اور اسلام کی آزادی میں مصالح تو ٹھکرا دیا۔ ان کو ہم ٹھکراؤ۔ زندگی کے لطف اٹھاتے ہوئے با اٹھاؤ۔ خدا مبارک کرے اور برکت دے۔ ملایسی بات سُنے سے نہ نکالو جس سے کبھی ہم کو اڑو اسلاف کی رگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے!

مولانا کی اس تقریر سے حاضرین پر اس سی ڈگتی۔ لیکن اس کے بعد ہی مولانا نے گفتگو کا رخ اس طور پر بدل دیا۔ کہ بات اتنی گنتی ہوئی اور سب لوگ سمجھتے ہوئے شخصیت تھے۔

مرحوم نے یہ تقریر کچھ یوں ہی نہیں کر دی تھی بلکہ اس کی تہ میں مرحوم کے خاندان کی بعض ملامت بھی ہیں۔

مولانا کے دادا مولانا سخاوت علی فاروقی محمدی صاحبزادی تھے۔ محمد علی شاہ عبدالحمید صاحب دہلوی اور امیر المجاہدین مولانا شاہ محمد اسلم خلیل شہید سرحدی تھے اللہ امام اللہ حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے۔ اور امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ ان شہیدین سعیدین کے فیضِ محبت سے مولانا سخاوت علی رحمۃ اللہ علیہ میں مجاہدانہ سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ۱۲۵۸ھ میں پیر و مجاہد ہندوستان کو دار الحرب سمجھ کر مکہ معظمہ کو ہجرت کر گیا۔

مولانا سخاوت علی مرحوم کا قائم کیا ہوا مدرسہ قمرانیہ اب بھی جون پور میں قائم ہے جس کی ترقی و نمو زانی تدریج مولانا ابوبکر صاحب مرحوم کے چچا مولانا محمد حنفیہ صاحب مرحوم اور ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی اور مرحوم کے والد ماجد مشہور عالم باعمل حضرت مولانا ابوالخیر محمد مسیحی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوئی۔ جن کے بعد مولانا مرحوم اس مدرسہ کے متعمد و ناظم ہوئے۔ مولانا سخاوت علی مرحوم نے اپنے عہد میں جیسے جیسے نازک موقع پر دین کی خدمت کی۔ اور ان کے فیضِ محبت سے جیسے جیسے علمائے دین پیدا ہوئے۔ وہ پورب کے فوج میں بچپن ہی کی زبان پر رہے۔

جس صحبت کا اوپر ذکر آیا۔ جس میں اس میں موجود تھا اور پور۔ یہ طور پر محسوس کر رہا تھا۔ کہ مولانا جو کچھ فرما رہے ہیں اس میں اس حرارت کا بڑا دخل ہے جو مولانا کو براہِ راست وراثۃً پہنچی تھی۔

مولانا کا بلا وصف یہ تھا کہ وہ ہر کام خواہ اپنا ہو یا بیرونی کسی کی خواہت سے انجام دیتے تھے اور کسی کو محسوس بھی نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنے یا کسی کے کام میں لگے ہوئے ہیں جن کو ان کا عہد یاد رکھ

کا کام کرتے تو اس کا موقع بے موقع اعلان بھی کرتے رہینگے کبھی معروضیت سے کبھی نام سازی طبع سے کبھی اپنے نقصان سے کبھی کوئی اور کام نہ کرنے کے بہانہ سے۔ پھر کر چکیں گے تو حسان منوانے یا اپنے اہمیت و عظمت جتانے کا کوئی موقع لاحقہ سے درویش گئے۔ اکثر ایسے بھی ملیں گے جو اپنے اسباب کر میں گئے جس کے کرنے کا ان کو کافی معاوضہ بھی ملتا ہے لیکن اس کا اعلان و اظہار اس طوعہ پر کریں گے تو یا کوئی بہت بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ یا ان پر بہت بڑا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ مروجہ اس کے بالکل برعکس تھے۔ معمولی سے معمولی کام ہو یا بڑے سے بڑا وہ اس کو اس طوعہ کرنا شروع کر دیتے جیسے ہم آپ فی شعوری طوعہ پر سانس لیتے ہیں، بیکسی قسم کا اعلان نہ کئے، بیکسی معاوضہ کے توقع کے اور ختم کرتے تو بس ختم کر دینے۔ بعد میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں مشعبہ فنون کے ایک طالب علم نے ایک ڈاکسٹریٹل سے ایک بار ایسے مضامین اغیار کرتے کی اجازت چاہی۔ جو مقررہ اوقات تعلیمی میں مغل ہوتے تھے۔ کونسل میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر وہ تنہا گفتگو ہوتی رہی۔ اور ایک دن تو یہ چاہتے تھے کہ ٹائم ٹیبل کے وقتوں میں اضافہ ہو۔ اور نہ اس طالب علم کی درخواست کو اسی بنا پر مسترد کرنا گوارا کرتے تھے۔ جب کافی بحث ہو چکی تو مولانا نے فرمایا۔ کہ کونسل اجازت دے گئے جس مضمون کے تعلیم کی گنجائش نظام اوقات تعلیمی نہ نکلتی وہ مروجہ کے سپرد کر دیا جاتے۔ وہ اپنے مقررہ گھنٹوں کے علاوہ اس طالب علم کو پڑھائیگے پینا پڑاس طالب علم کو مولانا نے وصال تک مسلسل انتہائی پابندی و انہماک سے اپنے ذمہ داری کے اوقات میں تعلیم دی۔

اپنے علم میں مولانا کو بعض بڑے نالائقوں سے بھی مقابلہ ہوا لیکن وہ ان سے اس طوعہ پر نباہ کرتے تھے کہ ہر شخص کو حیرت ہوتی تھی۔ مؤذنون اور پیش اماموں کی بڑی خبر گیری کرتے تھے۔ ان سے یہ سنت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ سال تک کہ ان سبوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ

مولانا اُن کے فہرست تھے۔ ان کے کاموں میں کبھی کوئی عجیب یا نقص نہ نکالا۔ اُن کی ذاتی و قنوق کو اپنا بنا لیتے۔ مولانا کے سپرد جو انتظامات تھے اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ قسم قسم کے مسائل اور طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا۔ لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ مولانا کسی قسم کے ترو یا دلویش میں مبتلا ہوتے ہوں۔ کبھی مل ہو رہی ہوں، کاغذی گھوڑے دوڑاتے جا رہے ہوں۔ اور ایک مہنگا مہر یا مہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مولینا کی منشاہ خود بخود ہر رنگہ پوری ہو رہی ہے۔ اور مولانا کا ہر ماتحت یا ان کے ساتھ کام کرنے والا اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہر فرض سلیمہ اور محنت سے ادا کر رہا ہے۔

ایک دن ہم سب سید بشیر الدین صاحب عثم بیوریٹی لائبریری کے آفس میں بیٹھے ہوتے تھے۔ مولانا بھی اپنے خاص انداز ذیل آسانی و خود اعتمادی کے ساتھ آئے، سب لوگ تعظیم اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا نے بغیر کسی تکلف یا مصنوعی اخلاق کے کہا ارے بیبل بیٹھے بھی رہو، کیا بانس ہو رہی تھیں، او کیوں بشیر ہمارا صاحب کہاں ہے (سید محمد حسین صاحب لکچر شعبہ انگریزی کی طرف اشارہ تھا) بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوتی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کہیں لگجیں۔ اُناتے گفتگو میں بشیر صاحب نے کہا کہ لائبریری کے قلمی اور شرفی نسخوں کو مال ہی میں نیو لکچر روم سے لائبریری کو منتقل کیا گیا ہے۔ کتا ہیں بے ترتیب ہو رہی ہیں۔ ان کتا بوں کی باند عدہ فہرست بن جاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔

مولانا نے فوراً فرمایا۔ فہرکی کوئی بات نہیں ہے یہ بھی کوئی کام ہوتا، طفیل احمد سے کہو مجھے یہ ذخیرہ دکھا دیں۔ میں فہرست تیار کر دوں گا۔ بشیر صاحب نے کہا، مولانا بڑا پتہ مار کام ہے آپ کا جسے کو تکلیف کریں۔ مولانا نے فرمایا جیسی فہرہ دیکھوں تو سہی، جس کام کو نو جوان پتہ نہ کھتے ہیں اُسے بڑھوں کو کم سے کم دیکھ لینا چاہئے۔ غرض مولانا نے کام شروع کر دیا۔

کسی کو کھانوں کا نذر نہ ہوتی۔ مذکور سلسل ہر روز کئی کئی گھنٹے لائبریری کے ایک گوشہ میں بیٹھے کام کرتے رہتے۔ اور بالآخر فرست مکمل کر دی۔ مولانا نے کبھی اس کا بھول کر بھی ذکر نہ کیا۔ کہ وہ کس کام میں مصروف تھے۔ یہاں تک کہ کام ہمہ وجہ مکمل ہو گیا۔ اس وقت بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مولانا نے فرست مکمل کر دی تو میں نے ہنس کر مولانا سے کہا، مولینا یہ آپ خواہ مخواہ کا دروس کو بیٹے خریدتے رہتے ہیں۔ کتنے طے نام بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی کوئی کام ہو، بشیر کو اس کی فخر تھی، میں نے کہا کام بھی اچھا ہے، فرصت بھی ہے کچھ دن اسی کی سیر رہے۔ اس فرست کے مرتب کرنے میں مجھ کو یہ فائدہ ہوا کہ بعض فوائد کے دیکھنے کا مسرت میں موقع مل گیا۔ اس ذخیرہ میں بعض ایسی کتابیں دیکھنے کو ملیں جن کو میں سمجھتا تھا کہ ناپید ہیں، کسی کا صرف نام تھا ان کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ کچھ ایسی بھی ملیں کہ اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آیا۔

اسی طرح دنیاویات کی لائبریری کو بھی مرحوم نے خود اپنے ہاتھ سے از سر نو ترتیب دیا۔ کتابوں کے انتخابات میں بڑی توجہ اور محنت سے کام لیتے تھے۔ علوم و اسلامیہ پر جو کتابیں بیرون ہندوستان شائع ہونے لگیں ان پر خاص نظر ہوتی۔ ہمیشہ اس فیکر میں رہتے کہ کون سی کتاب کہاں شائع ہوئی۔ اکثر دیکھتے رہتے کہ کس پبلشرین مشرق نے اسلامی ادب، شاعری، یا اس قبیل کی کسی اور موضوع پر تصنیفات شائع کیں۔ ان کے علاوہ مرحوم کون کون کتابوں سے خاص دلچسپی ہوتی جو مذہبی مباحث پر اردو میں شائع ہوتیں۔

اکثر کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے سلسلوں کی مذہبی زبان قواعد ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ براہ راست عربی فارسی سے استفادہ کرنے والے اب صرف وہ لوگ رہ گئے ہیں جو تحقیقات علمیہ کا کام کرتے ہیں، ورنہ عام طور پر اب ساری مذہبی معلومات اردو ہی کی کتابوں

میں ملتی ہیں۔ مولانا کی وسعت نظر کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان تمام ادیبوں کو دنیاویات کی لائبریری میں جگہ دیتے تھے جو فلسفہ مذہب، اخلاقیات یا اس قسم کے دوسرے مباحث پر لکھ رہے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے اوروں میں منتقل ہوتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں یونانی کتب کے ترجمہ سے اسلامی تصورات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا۔ اس سے کہیں دوسری شاخ موجود عہد میں پیش آنے والے ہیں کیونکہ فلسفہ کی ترقی سائنس کے انکشافات، مطبوعات کی اشاعت، طبعی ملائے کی سہولتیں، عوام و خواص دونوں کے ذہن و افکار کو ترقی و شدت سے متاثر کر رہی ہیں۔ اس لئے ان طبوعات پر نظر رکھنا بڑا ضروری ہے۔

یونیورسٹی کا قبرستان آج سے دس بارہ سال پہلے جسے آب و گیلہ بالکل ویلان پڑا ہوا تھا۔ نہ کوئی سایہ دار درخت اور نہ وہاں بچے کا ڈھنگ کا کوئی راستہ نہ نماز جنازہ پڑھنے کی کوئی تھری محفوظ جگہ، نہ محافظ قبرستان کے رہنے سمئے کا کوئی انتظام نہ میت کے لئے جمانے کے لئے کوئی تابوت۔ اسی طور پر یونیورسٹی کی مسجد میں کوئی وضو خانہ نہ تھا۔ لوگ تھوک کے گرد بیچہ کر وضو کرتے تھے۔ ناک تھوک سے پانی کو پاک و محفوظ رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میت کو غسل دینے اور کفن کرنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مولانا نے نہایت خاموشی اور سستہ سستہ رفتہ رفتہ ان سب کا معقول انتظام کر دیا۔

گورستان کا اب یہ عالم ہے کہ شاید اس سے زیادہ سبز اور سایہ دار جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں ہے۔ حداثہ پختہ سڑک بن گئی ہے۔ محافظ گورستان مع تمام ضروری سہولتیں کے مکمل ہو چکے ہیں۔ نماز جنازہ کی جگہ متعین ہے اور معین بنی ہوئی ہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے کہ دفن کوئی موقع آجائے اور محتول انتظام جلد اور بروقت نہ ہو سکے تو متعین دفن کا پورا

سامان موجود ہے۔ مسجد میں نہایت ہی سکھ اور غریبوں کی وضو خانہ ایک روشن اور محفوظ برآمدہ میں بنایا گیا ہے۔ غسل میت اور تجیز و تکفین کے لئے مسجد ہی سے ملحق لیکن الگ تعلق ایک جگہ مخصوص کر دی گئی ہے۔ یہ انتظامات جتنی ضروری تھے اتنا ہی ان کی طرف تین کم منتقل ہوتا تھا۔ لیکن مولینا کو ان کا پورا احساس تھا اور انہوں نے بعض دشواریوں کا نہایت خاموشی سے مقابلہ کر کے ان سب کا مناسب انتظام کر دیا۔

ایک بار یونیورسٹی میں اس کا بلاچر چارپا کا لڑکے کثرت سے سینا دیکھنے جایا کرتے ہیں۔ بوڑھنگ ہاؤس سے باہر شہر کے اندر، رات کے وقت نوجوان طلباء کا ایسے موقع اور مجمع میں موجود ہونا جن کو کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا، برا ہے اس سے ان کے خصال و اخلاق پر بڑا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے اور سرگام یونیورسٹی کے انتظامات میں لمبی بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سے بہتر ہو گا کہ خود یونیورسٹی کے احاطہ میں سلیما ہال کھولنے کی اجازت دینی چاہئے جس پر یونیورسٹی کے مستر کردہ قیود عائد ہوں۔

دوسرے لوگ یہ کہتے تھے کہ سینا قطعاً محرم اخلاق ہے، اس کے علاوہ خود یونیورسٹی میں اس کا انتظام ہونے دینا بڑی غلط فہمیوں کا باعث ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی میں ڈرامیٹک سوسائٹی پر بھی اعتراضات کئے جا رہے تھے کہ یہ چیز اسلامی درس گاہ میں نہ ہونی چاہئے۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا، مولانا اس سینما اور ڈرامیٹک سوسائٹی کے بارہ میں مذہبی نقطہ نظر کیا ہے۔ مروجہ نے فرمایا آئندہ ہی نقطہ نظر کے پیچھے کیوں پڑتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ مولوی سولہ مذہبی نقطہ نظر کے کسی اور نقطہ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ اور نہ خود اپنی کوئی راستہ رکھتا ہے مجھے یہ تو بتاؤ مذہبی نقطہ نظر



معلوم کرنے کی تم کو اتنی فیکریوں ہے۔ اس نقطہ نظر پر عمل کرو گے؟ ہندوستان میں بحالت موجودہ اس پر عمل بھی کیا جاسکتا ہے؟ آخر اس پر کیوں نہیں راہنی ہو جاتے کہ مذہبی نقطہ نظر کے پیچھے پڑے بغیر بھی معقول پسندی اور حسن تدبیر کو دخل دیا جاسکتا ہے؟

میں نے عرض کیا مولانا بات تو ٹھیک ہے لیکن میں ذرا گندہن اور صریح پسند واقع ہوا ہوں۔ معقول پسندی سے بڑی ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے کون بچے، مذہبی نقطہ نظر میں یہ آسانی ہے کہ حزب جی میں آیا خود جارہے سے باہر ہو گئے اور حزب جی پر ہا کسی جھلے مانس کی بچڑی اچھال دی۔ مولانا اپنے خاص انداز میں بنیہ آواز کی مہنسی خوب خوب سمجھے، پھر اپنے رد مال سے چہرہ پونچھنے اور رد مال کو ایک طرف رکھتے ہوئے بوسے، دیکھو اسلام ایک مجموعہ ہے محض معتقدات اور مکمل اعمال کا۔ اس کے ہر جز کو کل میں دیکھنا چاہیے نہ یہ کہ کل کو نظر انداز کر کے جز پر کھڑے مریں۔ جہاں اسلام کا مکمل، مستقل و متوث نظام نافذ نہ ہو وہاں ہر مسئلہ یا ہر شریک کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنا بیجا اور اس کو بروئے کار لانے کی کوشش مضر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر اس پر عمل کیا جاتے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے، کسی مستقل و معقول محبت میں اس پر مفصل گفتگو ہوگی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب کسی ناگزیر خرابی یا قیامت کا انداد ناممکن ہو تو انداد کی نہیں بلکہ اصلاح کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھ لو کہ ڈرامے میں سوانگ بھرنا، گانا، ناچنا اور مصنوعی حرکات یا باتیں کرنا مردوں بالخصوص مسلمانوں کو زیب نہیں دیتیں۔ ورزش، انفرج، تسلیم، کارکردگی یا اظہار کمال کی اور بہت سی معقول صورتیں بھی تو ہیں۔ آخر ڈرامہ ہی کو سب کچھ کیوں سمجھ لیا جاتے۔ اچھے ڈرامے کھو اور اپنی فحش کی زیبانی و رسائی کا ثبوت دو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسے کرنے بھی لگو۔ فنون لطیفہ کو بحرینی بالعموم

پنہاتے جاتے ہیں۔ اسلام نے اس کو گواہ نہیں کیا ہے لیکن فہم لطفیہ کی تفسیر میں مسلمان کسی سے  
چھٹے نہیں رہے ہیں، اسلام طبعیت کی اچھ کو نہیں روکتا۔ البتہ اس کی نامعقولی تفسیر و تشکیب و  
 اختلا ب کرتا ہے۔ مسلمانوں کا جمالیاتی تصور کسی سے کم نہیں۔ انسانی اعمال و افکار کی تیار  
 کا غور سے مطالعہ کرو تو تم کو معلوم ہو گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بے سرو پا نہیں ہے۔ —

علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کو علی گڑھ اس لئے عزیز ہے کہ اس میں ہر ذوق کی تسکین و  
 تفریح کا سامان ہیما ملتا ہے۔ جو شخص جس قماش کا ہو گا اس کو اسی قسم کی مکمل سوسائٹی میسر آ  
 جاتے ہیں۔ علی گڑھ کی ہر دلعزیزی کا یہی راز ہے۔ وہ نہ مقامی اعتبار سے علی گڑھ میں کوئی جاہلیت  
 نہیں ہے۔ دوسرے بڑے شہروں کے برخلاف یہاں نہ غلط درجہ کی دکانیں ہیں۔ نہ منافہ فطرت  
 نہ تفریح کا ہیں۔ یہاں کا کوئی شخص محض تفریح کی خاطر کبھی شہر نہیں جاتا اور کسی کے لئے یونیورسٹی  
 کی حدود سے باہر دل بستگی کا کوئی سامان ہے۔ ہر شخص کو اپنے جی شخصوں سے ملنے میں دل چاہی کا سارا  
 سامان میسر آ جاتا ہے۔

پڑھنا لکھنا، کھانا پینا، شوخی شرارت، کھیل کود، رزمی و پارسی، معرض یونیورسٹی کی  
 مکمل زندگی میں جن اسباب یا مواقع کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ یہی سبب  
 ہے کہ علی گڑھ والے جب کبھی اور جہاں کہیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں فوراً بے تکلف ہو  
 جاتے ہیں۔ ان کو تعین یا تکلف کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ اس قسم کی طرز عمل پر قائل ہو  
 سکتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فریقین ایک دوسرے کی اچھائی برائی سے واقف اور علی گڑھ کی روایات  
 سے آشنا ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی گڑھ والے کبھی اپنی کی تشییت سے نہیں مل سکتے۔

مروم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اتفاق سے بھی کسی محبت میں پہنچ جاتے تو حاضرین  
 میں سے کسی کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ کوئی اپنی محل محبت ہوا ہے چہ جائیکہ وہ مولوی ہو جس کے

بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کی چوٹی کسی خانہ میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ یونینہ سٹی میں ہر طرح کے لوگ اور ہر طرح کی سوسائٹیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخصوص معلقوں کے مخصوص طور طریقے ہوں گے۔ کوئی پھکڑے کوئی سنجیدہ، کسی کو سیاسی مسئلہ سے دل چسپی ہے تو کسی کو مذہبی باتوں سے ملے لیکن ہوتی ہے۔ زندگی کو کوئی کسی زاویہ سے دیکھتا ہے کوئی کسی زاویہ سے۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ مروجہ یونیورسٹی کے ناظم و بینیات تھے جس پر منصب کے اعتبار سے خاص خاص پابندیاں لگتی تھیں اور انہیں پابندیوں کے اعتبار سے اسکے کارکنان متعین ہوتے تھے۔ بایں کہ عجیب بات تھی کہ مولانا کی غیر متوقع آمد پر بھی لوگ خوش اور شادمان تھے گفتگو کی روانی اور تسلسل میں کوئی خرق نہ آتا اور لوگ آہستہ کرتے کہ مولانا بھی ان کی گفتگو میں شریک رہیں۔

مرحوم کی ہر شخصیت کا کمال یہ تھا کہ کبھی کسی حالت میں نہ اپنے سرو سے خود متجاذب نہ ہوتے تھے۔ مرحوم کو خدا نے ایسا منواندن دل و دماغ دیا تھا اور ان کی شخصیت اتنی دلاور تھی۔ کہ ان کو اپنے منصب کی آڑ پکڑنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ انہوں نے اپنے طور طریقوں سے کبھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ ناظم و بینات یا عالم دین تھے۔

ممکن ہے میرے محض اتنے سے بیان سے بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے میں اس کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

فرس کیجئے کہ کسی مذہبی یا اخلاقی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے، مرلینا کبھی کوئی آیت یا حدیث نہ پڑھیں گے۔ اور نہ آئمہ و کابر کے اقوال پیش کریں گے۔ وہ بالکل ایک معمولی انسان کی طرح بحث میں حصہ لیں گے اور اپنا نقطہ نظر اس طور پیش کریں گے کہ آپ کو اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی ہمت ہوتی رہے گی اور بحث میں آپ کی دل چسپی بڑھتی رہے گی۔ سنا ہے آپ یہاں تک محسوس کرنے لگیں گے کہ اس سے بہتر کوئی اور موقع اس مسئلہ کے سلجھانے کا نہیں ہے۔

اس قسم کے اکثر مواقع پیش آتے رہتے تھے۔ میں مولانا کی خدمت میں ایک حد تک میٹاک تھا اور میری ان بالوں سے مولانا مجھے اور زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار ایک طویل علمی اُمرہ کے بعد میں نے مولانا سے عرض کیا۔ مولانا بات تو آپ میٹاک کہتے تھے لیکن یہ ساری باتیں بدریہ گوئی و بدریہ آفرینی کے سلسلہ میں تھیں یا اللہ اور رسول کے کلام سے بھی ان کی سند ملتی ہے۔ مولانا اپنی ذہین اور دل نشیں آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہی اپنی مخصوص منہی ہنسنے جس میں آواز بالکل نہیں نکلتی تھی لیکن منہی کے زور سے سارا جسم جھٹکنے لگتا تھا، پھر فرمایا تمہارے سوالات بھی خوب ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ رسول کے بارہا میں آج کوئی فیصلہ کن راستے قائم کرنے والے ہو۔

میں نے عرض کیا مولانا فیصلہ کن، نہیں فیصلہ ہی کیسے اس لئے کہ میں فیصلہ تو اکثر کر لیا کرتا ہوں۔ البتہ اس میں ایک بڑی کمزوری یہ رہ جاتی ہے کہ فیصلہ تو میں کرتا ہوں لیکن کن اللہ میاں نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ مولانا اس فقرہ سے بہت محظوظ ہوتے پھر فرمایا، میں جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق کلام الہی اور حدیث نبوی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مروجہ آیات قرآنی سنائیں اسلامیت کا حوالہ دیا۔ غرض ہر بات پورے طور پر منقح کر دی۔

مروجہ کا یہ خاص و طبع تھا کہ جب کوئی مسئلہ چھڑتا تو سب تک ان سے خاص طور پر رجوع نہ کیا جاتا۔ وہ خواہ مخواہ مباہلہ میں شریک نہ ہوتے۔ برخلاف بعض لوگوں کے جن کی عام عادت یہ ہے۔ کہ ایسے مواقع پر وہ جو کچھ جانتے ہیں اُسے بے تکان بتانا شروع کر دیں گے۔ اور یہ کوشش کریں گے کہ لوگ ان کے فکرو نظر کے قائل ہو جائیں چنانچہ اس ذلت تک نہ چپ ہوں گے جب تک ان کا مبلغ ظلم ختم نہ ہو جائے یا لوگ صفات خود مختلاری میں بھاگ نہ کھڑے ہوں۔

لیکن جب کوئی بات مولانا سے رجوع کی جاتی تو وہ نہایت خوشی، نہایت اطمینان اور نہایت اعتماد کے ساتھ گفتگو کرنے اور علوم و احکام دینیہ کے تمام نکات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے۔ بعض مسائل ایسے ہوتے جن پر رائے کو اختلاف ہونا اُسے بھی بڑی صفائی و صداقت کے ساتھ واضح کر دیتے، مروجہ علوم دینیہ پر بڑا عبور تھا۔ کتابوں کے حوالے اور احکام کے اقوال بڑی دیانت اور بڑے دُلق سے پیش کرتے۔ اس وقت مجھے یہ جرت ہوئی کہ یہی مولانا جواب تک ہم سب کے ساتھ خوش گپتی میں مصروف تھے۔ ایک متعجب عالم کے فرائض اُس خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

مروجہ کو عام طور پر گفتگو کرتے یا رہتے تھے دیکھ کر کسی کو مشکل یہ گمان ہوتا کہ مروجہ کا علم کتنا حاضر و قنوا وسیع اور کتنا گہرا ہے۔ ہم سب بھی آخر لکھنے پڑھنے ہی کا شغل رکھتے ہیں۔ ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو علوم جدیدہ سے پورے طور پر نا آشنا ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو دونوں علوم پر ابھی نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ علوم دینیہ سے پورے طور پر آگاہ نہ ہونے کے باوجود ہم اس امر کا تو پتہ رکھا ہی سکتے ہیں کہ کس بحث میں کس کا کون سا پہلو کمزور ہے۔

میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ مولانا مذہبی نقطہ نظر اس انداز سے پیش کر رہے ہیں کہ وہ غافلانہ مذہبی نقطہ نظر نہ تھا بلکہ اُن کے مد نظر بہارِ اہی اصول بحث تھا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا ہمیں لوگوں میں ایک تھے اور ہمارے ہی علوم سے بحث کر رہے ہیں۔ وہ بحث میں ایسی مثالیں پیش کرنے جو موجودہ دور میں مسائل عمر نہیں بلکہ مسئلہ فیصلے تھے جن پر تجربات جدیدہ کی ہر امتداد لگی ہوئی تھی۔

علوم اسلام میں جو تجربہ مروجہ کو تھا۔ اُس سے قطع نظر دیگر علوم و فنون سے بھی مولانا کو بڑی دل سپاری تھی۔ مروجہ کو ریاضی میں بڑا درک تھا۔ میں نے ریاضیات جدیدہ کے بعض کالمین کو یہ لکھتے سنا کہ مولانا کو ”ریاضی“ اور ”اقلیس“ پر بڑا عبور تھا۔ عربی میں ریاضی کا جو سرمایہ ہے اس کا

مستحق حق مولانا کی نفس سے گزر چکا تھا۔ فلکیات سے مرحوم کو خاص لگاؤ تھا۔ رات میں چھوٹے  
 پڑیٹے ہوئے جن جن ستاروں کے عجیب و غریب نام عربی فارسی میں آتے ہیں۔ ان سب کو دکھاتے  
 بناتے۔ ایک دفعہ سمت قبلہ کی بحث آگئی مولانا نے قلوب تارہ کا مقام اور مختلف مختلف ستاروں  
 کو ایک ایک کر کے بتایا۔ محدثین کے ماہرین فلکیات نے اپنے حساب کی رو سے جن ستاروں  
 کا محمل یا مقام بنایا تھا۔ اور امتداد زمانہ سے ان میں اب جو تفاوت پیدا ہو گیا ہے ان سب  
 کو بڑے لطف و وضاحت سے بیان کیا۔ اسی سلسلہ میں جنتوں کی مفصل تاریخ اور ان کے  
 اصول ترتیب و تدوین بھی سنائے۔

ایک دن کھٹے لگے اور کیوں جی رشید غالب کے کلام میں نباتات الغش کا نام آیا ہے۔ ان  
 کو دیکھا بھی ہے یا نہیں؟ میں نے کہا جی نہیں۔ فرمایا دیکھو گے۔ میں نے کہا اب کیا دیکھوں۔  
 ان کے دیکھنے کا لطف تو غالب ہی کے زمانہ میں تھا۔ یونیورسٹی کے عہد میں دیکھ کر کیا کروں گا،  
 ہوں گی بھی تو رینفام ہی میں ہوں گی سورنہ آپ دعوت دیہ کیوں دیتے! مولانا بہت لطف اندوز  
 ہوتے۔

ایک زمانہ میں میلارو کا کام ملکا تھا۔ صرف چند مہینوں کو ان کی معمولی کتابیں پڑھانی  
 ہتھیں۔ اس کے بعد جی اے اور ایم اے کا فارسی کا کام بھی سپرد کر دیا گیا تھا۔ ایم اے کا تصوف  
 کا پیر میرے سپرد تھا۔ اس میں دو کتابیں لوائیج جامی اور محمود شبیر کی نگاشتن راز رباعیوں  
 لاجبی کی شرح گلشن راز) ایسی نقیب جن میں بعض افادات مجھے اسلامی فلسفہ منطق، تصوف و  
 معنویات کے مسائل ہمہ سے سابقہ پڑتا تھا۔ میں مرحوم سے رجوع کرتا تو وہ ان کی وضاحت  
 اس خوبی اور اعتماد کے ساتھ کہتے کہ جی خوش ہو جاتا اور ایک خاص طرح کا ذہنی انشراح ہوتا۔  
 اس کے علاوہ اکثر محبتوں میں نظیری اور غالب کے کلام پر محاکمہ کیا جاتا۔ اس وقت

معلوم ہوتا کہ مولانا کا فارسی شاعری اور فارسی ادب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور سلجھا ہوا تھا مرحوم کے سامنے اردو کا کوئی ایسا شعر چڑھا جاتا۔ تو اکثر وہ اس سے ملتے جلتے مضمون کا فارسی یا عربی شعر منادیتے۔

مرحوم کو صرف عربی فارسی کی ادبیات سے ذوق نہ تھا بلکہ اردو اساتذہ کے بھی ان گفت اشعار یاد تھے اشعار مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ محسن کا کردی کی تقریباً ہر مشہور نظم یا نظم جس کو ایک خاص ترنم سے پڑھتے، اکثر کہا کرتے تھے کہ مذہبی تعقیدات کو لکھنوی شاعری میں جس طرح محسن نے سمویا اور بنا ہائے وہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

اسلامی قانون وراثت پر بڑی اچھی اور گہری نظر تھی، قانون کے اکثر طلباء و فاضل کی تقسیم سمجھنے کے لئے مولانا کے پاس آیا کرتے تھے اور طلباء کو پورے طور پر متنب کر دیتے تھے۔

عرصہ کی بات ہے یونیورسٹی میں ایک ہنٹ ماسٹر رکھے گئے تھے۔ بڑے ثرلین اور محبت کرنے والے انسان تھے اور اس فن کے امام وقت تھے۔ مولانا سلیمان شاہ شرف صاحب مرحوم ان پر بہت قربان تھے اور اپنے دوستوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی ہنٹ سیکس میں۔ اکثر صاحب نے سیکسنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک صاحب جن کی نظر سے یہ سطور یقیناً گزریں گی۔ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ ایک دن نماز فجر کے بعد مرحوم گھومتے گھاسٹے ان کے گھر جا پہنچے۔ بانور، بالور، ہیں پو پھینے نکلے اور کیوں صاحب کچھ ہنٹ کی فہمی مشق سہم پہنچتی ہے۔ انہوں نے فرمایا جی ہاں دو چار ہاتھ سیکھے تھے لیکن ادھر نہ ہوتا رہا۔ اس لئے مشق و معافی کی نوبت نہ آئی اور بیچ و پیر سے بھی کچھ عید لے لگا ہوں۔

مرحوم نے فرمایا اچھا مجھے بتائیے کیا سیکھا تھا پوناچہ انہوں نے دو چار ہاتھ دکھائے۔  
مرحوم نے فرمایا اچھا آؤ میں مشق کرا دوں . . . . . صاحب کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم

نے اس سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے اور جس صفائی سے لکڑی چلائی اور اس کی بندش کی وہ ہر اعتبار سے استناد نہ تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بہت سے فن میں مرحوم طاق تھے۔

مرحوم کو مردانہ کھیل بہت پسند تھے۔ شکار کے بڑے شائق تھے، گولی بھی خامی چلا لیتے تھے۔ شکار پارٹیوں میں اکثر شرکت کرتے اور شکار میں چلائی "تو وہ ایسی کر لیتے تھے۔ کہ نوجوان دنگ رہ جاتے تھے۔ غلیل چلانے کی بڑی اچھی مشق تھی، اس فن کے رموز سے خوب واقف تھے۔ غلیل دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کہاں کی بنی ہوئی ہے، کس زمانہ کی ہے اور کس کو ٹھی کا بانس ہے۔ بانس کی چھڑی بہت پسند کرتے۔ بانس پہچاننے کا عجیب ملکہ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں اس قسم کی چھڑی یا ڈنڈا پا لیتے تو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بڑے شوق سے دیکھتے بھاٹتے اور بتاتے کہ بانس کی چھڑی کس طرح بنائی، سدھاری جاتی ہے۔ اس کی گرہیں کیسی بنائی جاتی ہیں۔ کیسے اس پر رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ کس طرح پختہ کرتے ہیں اور کیا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ایک بار ابھرے ہوئے معروف (رطیب) کی چھپائی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مرحوم نے فرمایا کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ میں اس قسم کی پیرائے تھی۔ اس وقت مشین تو تھی نہیں لوگ ناخن سے اس طرح کی چیز بنالیتے تھے اور یہی ایک طرح کا فن تصور کیا جاتا تھا۔ پھر فرمایا اب مشق تو رہی نہیں لیکن کوشش کرتا ہوں، شاید کچھ ہو جائے۔ اس کے بعد ایک معمولی سے کاغذ کے پرزہ کو چٹکیوں کی گرفت میں لے کر تلے اور پھر اس طرح ناخن سے کچھ کے دے کہ قغڑی جی بر میں چند حروف ابھر آتے۔ جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی ذاتی سے ابھرے ہوئے حروف چھاپوتے گئے ہیں۔ فرمایا جب مشق تھی تو پوری عبارت لکھ لیا کرتا تھا۔

ایک دن بھی ملاقات نہ ہوئی تو پوچھتے کہ کہاں تھے، کیسے ہو۔ مسکرا کر محنت اور دوستی



کے لہجہ میں شفقت کے انداز سے۔ دوستوں کے بارہ میں لطف و مرحمت کا کوئی جملہ نہ کہتے۔ کوئی ایسی بات ضرور کہتے جس سے مجھے اپنی فرزانگی یا شرافت کا احساس ہوتا۔ زمانہ زندگی کی عارضی یا سلسلہ مکروہات یا سیرت کے بعض داغ و جھے وحل جاتے۔ یا مدغم پڑ جاتے اور محسوس ہونے لگتا کہ شرافت و اول العزمی، غلق و مرحمت دنیا کی بڑی چیزیں اور زندگی کی بڑی آسودگیوں ہیں۔

میرا پڑانا مکلان مرحوم کے مکلان سے بالکل قریب تھا۔ متاز ہاؤس کے پورب میں ایک بڑا میدان ہے۔ اُس میں ہو کر مولانا کالج اور مسجد جاتے۔ مئی جون کی علی گڑھ کی گرمی میں جب آگ برستی ہوتی اور گرد و غبار سے فضا تیر و تار ہوتی مولانا طرکی نماز پڑھانے اس میدان سے گزرتے۔ اسی پابندی وقت سے جیسے گھڑی سنبھلتی ہے۔ بالکل صبح کو کئی مجاہد میدان جنگ میں جاتا ہے، نہایت ہی ادنیٰ قسم کی کھد کی عباد۔ کھد کی عددی۔ کھد ہی کا لبا کڑتے اور ٹخنوں سے اونچا پا جامہ۔ ایک لبا سا دھال کا ندھیر۔ موسم کی شدت ہوتی تو اسی سے ٹالا اور کان چھپاتے ہوتے۔ سر پر مہار۔ پاؤں میں رُخ رنگ کا ڈھیللا ڈھالا پنجابی وضع کا جوتہ۔ مولانا کی عمر غالباً ۵۵ سال کی ہوئی۔ جسم و جسمات کے اعتبار سے منسا نہ تھے، بال کافی سپید ہو چکے تھے لیکن طبیعت ایسی مروانہ پائی تھی کہ ان کے کسی فعل سے کبھی یہ محسوس ہوتا کہ مولانا کی رفتار گفتار یا کردار میں ٹھکن کا کوئی شائبہ بھی تھا۔ منزلیں مارتے پیدل آتے ہیں۔ اور اپنے لیے رومال سے پاؤں کی گرد طافت و امتلا سے جھٹک کر کسی منڈیہ یا چار پائی پر بیٹھ گئے۔ نہ زبان سے کوئی ایسا فقرہ کہیں گے اور نہ تیر سے اس کا پتہ لگے گا کہ کان غالب ہے۔ اسی طور پر جب آٹھ کھڑے ہونے تو نہ بوڑھوں کی طرح کمر ہاتھ رکھ کر۔ کسل من ہو کر با آہ کر کے کھڑے ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا جیسے تازہ دم آٹھ رہے ہیں۔

ان کا ڈھیلا ڈھالا کھدکا لباس، سپاہیانہ عمامہ ہاتھ میں ڈنڈا۔ قدم بے اور ہوا جیسے کوئی قواعد پر پڑ کر رہا ہو۔ کوئی واقعہ ہو کسی حال میں ہوں۔ یہ ناممکن تھا کہ قدم کی لمبائی میں یکہ انچ کی کمی بیشی ہو جاتے یا رفتار میں بھول آجاتے۔ مسجد جا رہے ہوں، کلاس پڑھا کر نکلتے ہوں دوسنوں کے ساتھ ہوں یا جنازہ کے ہمراہ اس مستعدی سے بڑھتے تھے جیسے ہر بات میں ہر شخص سے سبقت کرنا چاہتے ہیں۔ خوشی ہو باغی لب و لہجہ کے مردانہ پن میں فرق نہیں آنے پاتا تھا۔ کوئی متعل ہو کسی شخص کا سامنا ہو مرموم کہیں بھجکتے نہیں تھے۔ بڑے سے بڑا آدمی ہو ہمیشہ گفتگو اس طور پر کرتے جیسے کسی اپنے برابر کے آدمی سے مل رہے ہیں۔ لہجہ میں استواری بات میں صفائی، چہرہ پر مردانگی، انداز میں شگفتہ سنجیدگی آتے تو بزرگ خوش ہو جاتے، ہاتھ توڑی خوش آمدید نفسا چھوڑ جاتے۔

میرے مکان کا صدر دروازہ آتے جاتے پہلو پر پڑنا جو بالعموم کھلا رہتا تھا۔ مرموم کا معمول تھا کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔ کوئی ہمان ہوا تو اس سے غور ٹوی ویرنگ گفتگو میں آگیا تو خیر و نہ اطلاع کبھی نہ کراتی۔ اندر بچے من پانے کہ مولانا شریف لاتے ہیں تو بھاگ کر باہر گئے۔ مولانا بھی اسی انتظار میں ہوتے، دودھ سے کتے بھاگ آجھاگ آ اور عبا میں پھسپس جابھرتا۔ تو بڑھتے بتا۔ ممتی کہاں گئی۔ میں کتنا معلوم نہیں البتہ آپ کے بھائے بچے دو پاؤں نظر آجھ سے ہیں۔ کتے اسے وہ نوپل گئی اپنے پاؤں چھوڑ گئی۔ یہ کتے اور اس کا پاؤں عبا ہی سے ڈھانکتے جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میدان سے گزر رہے ہیں، پرتل نے دیکھ پایا۔ سب کے سب شور مچاتے پہنچ جاتے اور کتے جبا میں پھپھاتے، مولانا کتنے ہی ضروری کام سے جاتے ہوں فوراً ٹھہر جاتے۔ ہر ہمارے طرف طلباء اور لوگ آتے جاتے ہوتے۔ مولانا ان پرتل کی فرمائش کو پورا

کرتے اور آئینہ روزندگان سے پوچھتے بناؤ فلان بچہ کہاں ہے۔ لوگ بھی ٹھہر جاتے اور مولانا کی اس تصریح کا تہ شاو بخینے۔ کتنی بچے ہوتے اور عبا میں جگہ نہ ملتی تو کسی کو اپنا ڈنڈا دے دیتے۔ کہ لے اسے گھوڑا بنا کر دوڑا۔ ورنہ کا ندھے سے رومال اتار کر اس پر ڈال دیتے اور اسے بھی چھپا لیتے۔

جاڑے میں کھدر کی پوری آستین کا شلو کا پٹنے اور نہایت معمولی داموں کا کمل نہا کپڑا عبا کی شکل میں استعمال کرتے۔ صرف گرمیوں میں اکثر لمبے کرتے پر ایک مدداری استعمال کرتے۔ لیکن ایسا لباس صرف اپنے گھر پر یا بنے تکلف دوستوں کے ہاں جانے وقت استعمال کرتے۔ ڈنڈا اور عمارہ البتہ کبھی نہیں ترک کیا۔ ڈنڈے کے سہارے کبھی نہیں چلے بلکہ اسے اس انداز سے لے کر چلتے تھے گویا سہارا مقصود نہ تھا۔ بلکہ اس سے اظہار اعتماد و افتخار تھا۔

بچندہ دینے، سائل کی امداد کرنے اور اچھی چیزیں خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن موقع آن پڑنا تھا تو اپنی بساط سے زیادہ صرف کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی قدما زردہ ہو کر مروج سے کہا کہ آخر آپ اس قدر شاہِ غریب پر کیوں اتر آتے ہیں۔ مولانا مسکراتے، فرمائے تھے، بھائی دیکھو تو کوئی مانگتا ہے مجھے بھی زودیتا ہوں یوں تو پھینکتا نہیں پھرتا۔ میں نے عرض کیا جب آپ کی اس کمزوری سے لوگ واقف ہو جاتے ہیں کبھی نہ مانگ سکتے ہیں، کہنے لگے اچھا سنو ایک عرب کا فقہ تم کو سنا دل۔

ایک عرب کی ملاقات اپنے بھائی دشمن سے ہو گئی، عرب کے پاس نہایت اچھی تلوار تھی۔ دشمن نے تلوار ہی کی فرمائش کر دی۔ عرب نے بغیر کسی تکلف کے تلوار حوالہ کر دی۔ بات آئی گئی ہوتی، کسی دوست نے عرب سے کہا کہ یہ عاقبت کیوں کی۔ تم تو نیتے ہو گئے تھے اگر دشمن نے حملہ کر دیا ہوتا تو کیا کرتے؟ اس نے کہا ٹھیک کہتے ہو انہی سی بات میں بھی سمجھتا تھا اس کے۔

اس کو کیا کروں۔ جب وہ مانگ بیٹھا تو میں کیسے نہ دیتا۔ غور کر دیا وہ مانگ بیٹھا!!  
میں نے بہت کم لوگوں کو مولانا جیسا کنبہ پرورد و سماں نواز پایا۔ ان کا گھر ہر طرح کے  
سمانوں، عویزوں اور نوواردوں سے بھرا رہتا۔ میں نے آج تک نہ دیکھا کہ مولانا کے ہاں پہلا  
ابھنی نہ موجود ہوں۔ جو کھاتے وہ سب کو کھلاتے، چاتے، کھانا، فراکات، غرض اس قسم  
کی تمام باتیں سب کے ساتھ باہر مردانہ میں ہوتیں۔ پیر مہر م کے خاندانی روایات میں سے  
تھا۔ وطن میں بھی مولانا کا گھر ہر طرح کے لوگوں کا ماویٰ و ملجا تھا۔ جس کا جی چاہے چلا لے۔  
گھر والوں کی طرح رہے سہے، کوئی نہ بوجھے گا کہ آپ کون ہیں۔ کیسے آئے کب تک رہتے گا۔  
اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو زندان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اُس سے کوئی تکلف  
نہ برتا جاتے گا۔ اس کا جی چاہے تو وہ ہر محبت میں ہر گفتگو میں بلا تکلف شریک ہو۔ بالکل  
یہی نقشہ علی گڑھ میں پندرہ سال تک رہا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ علی گڑھ کے ایک بڑے صاحب اقتدار بزرگ مولانا کے ہاں  
اتفاقاً آگئے، سہ پہر کی چائے ہو رہی تھی۔ مجمع دیکھ کر وہ تھکے اور دریافت کیا کہ کس کا  
آئیٹ ہو؟ آئیٹ مولانا بھی مجمع ہی میں ملے جلے ایک طرف بیٹھے تھے۔ بوسے آجائے آجائے یہاں  
ہر شخص آئیٹ ہو رہا ہے۔ ان بزرگ کو اب تک اس پر تعجب ہے کہ ایک مولوی جس کی آمدنی باتخواہ  
بالکل معمولی تھی اُننا شاہ خرچ کیسے ہو سکتا ہے۔

مہر م کو چائے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے تکلف اور تیاری سے چائے پیتے تھے۔ جمعہ کی نماز  
کے بعد مسجد سے ملحق اپنے دفتر کے کمرہ میں کچھ دیر قیام فرماتے مہر م کے حساب اور معتقدین بھی آ  
جاتے چائے کا دور ہوتا، سب لوگ لطف و اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے اور مہر م کی سنجیدہ  
پر خلوص اور شگفتہ باتوں کے مزے لیتے۔ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اُس حلقہ میں بیٹھنے والے اس بات

کا فخر و مسرت کے ساتھ انہما کرتے کہ ناز جمعہ کے بعد مولانا کے ہاں بیٹھے جاتے پی اور گفتگو کی۔  
 رمضان فریقین ہیں جب مہرم مسجد میں مختلف ہوتے تو بھی یہ ایک خاص بات سمجھی جاتی۔  
 کہ مولانا سے احتکاف میں ملاقات ہوتی۔ ہر کلامی و ہم نشینی کا یہ وقت اتنا اچھا گزرتا تھا کہ  
 لوگ اس کو دن کا بہت اچھا واقعہ خیال کرتے تھے۔ مسجد کے شمالی سرے کی آخری محراب میں  
 مولانا محتکف ہوتے تھے اور پھر تکہ اس زمانہ میں کہیں ملنے ملائے جانے میں نہ سکتے تھے اس لئے  
 ہر شخص کو اپنے اپنے معمولات میں خلا سا محسوس ہوتا اس لئے بالآخر مہرینا سے ملنے مسجد میں  
 جاتا۔ ہر شخص سے اس کے مذاق کی گفتگو کرتے، طرح پیش کرتے، دوسرا باتیں منہ ہی کی بھی کرتے۔  
 اور ایسا ظاہر کرتے کہ روزہ کی کوئی تکلیف ہے اور نہ احتکاف کی پابندی گراں ہے بلکہ ان  
 دونوں کو وہ ایک ایسا رنگ دے دیتے تھے کہ یہی چیزیں خوش آئند معلوم ہونے لگتیں اور لوگ  
 مولانا کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری سمجھنے لگتے تھے جیسے سیر و تفریح کے لئے جانا، یہ مولانا کی سیرت  
 کا عجیب پہلو تھا کہ ان کے معمولات دوسروں کے لئے ادارہ بن جاتے تھے۔ ناز جمعہ کے  
 بعد مولانا کا اپنے دفتر میں ٹھہرنا اور چلتے پھینا یا احتکاف میں بیٹھنا مولانا کے معمولات میں سے  
 تھا۔ لیکن دوسروں کے لئے یہی محبت ایک معاشرتی ادارہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور جب  
 تک یہ لوگ اس حلقہ میں بیٹھے نہ جیتے تھے ان کے روزانہ پروگرام کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ یہی وہ  
 مقام ہے جس کے بارے میں افسوس کرنے کا ہے۔

روزہ بظرف اٹھا لیں وہی مسافر بن جاتے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

موسم سے مہرم کبھی متاثر نہ ہوتے۔ پنج وقتہ ناز مسجد میں پڑھی اور پڑھائی، جاہل دل میں  
 فخر کی ناز اول وقت مسجد میں جا کر پڑھائی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مغرب کی ناز پڑھ کر

دوستوں میں پہنچتے اور عشا کے وقت رخصت ہو جاتے۔ اکثر ہم لوگ مولانا سے عرض کرتے مولانا کہاں جاتے گا، آج تو منشی جی ہی کو امامت کا افتخار حاصل کرنے دیجئے۔ کہتے نہیں بھائی منشی جی کے پیچھے نماز پڑھنے سے لوٹ گھبراتے ہیں۔ طلباء کا سابقہ ایسے سے نہ ہونا چاہیے۔ تم لوگوں کا جی چاہے تو بیٹھے رہو میں نماز کے بعد آ جاؤں گا۔ اکثر منشی جی کو نماز پڑھانے کا موقع دے دیتے۔ چھبھم لوگوں کا دل رکھ لینے کے لئے ہوتا۔

اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ مولانا کسل محسوس کر رہے ہیں۔ یا بڑے لطف کی گفتگو ہو رہی ہے۔ یا کسی کام میں بڑے انماک شے خول ہیں کہ نماز کا وقت آ گیا۔ مولانا پانی ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور نماز پڑھانے چل دیں گے۔ اس طو پر جیسے ان میں نئے سرے توانائی پیدا ہو گئی یا کوئی بڑا خوش گوار مرض یا تو بگیا لطف پر کہ ایسے مواقع پر وہ کسی کو قطعاً میں نہ ڈالتے اور مجھ میں نہ ہونے دیتے تھے کہ وہ تو نماز پڑھانے بار رہے ہیں اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ بعضوں کا رویہ ہوتا ہے۔ یعنی کوئی شرعی فرض بھی بجالا نہیں گئے تو اس طو پر کہ دوسروں کو نہ جانتے فرار ملے نہ جانتے عافیت۔

ایسے لوگ ہم میں آپ میں اکثر ملیں گے جو فریضہ مذہبی ادا کرنے کے لئے اس طو پر تیار ہوتے ہیں گویا ان کا عبادت الہی کے لئے آمادہ ہونا ہی دوسروں پر عذاب الہی نازل ہونے کا موجب ہو گا۔ عبادت الہی یہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ خدا ان کی عبادت کو اپنی تجید و تسبیح نہ سمجھے بلکہ غافل کے خلاف منفرد سچائی سمجھ لے اور اسی اعتبار سے ان کو جزا اور دوسروں کو سزا دے۔ یہ جنت میں۔ ”سرکاری گواہ“ بن کر جانا نیا دل پسند کرتے ہیں۔

آہ، مولانا مرحوم ایسے نہ تھے۔ انہوں نے مذہب کو ڈرانے دھمکانے یا فخر و پندار کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا۔ ہم لوگ کبھی کبھی دینی یا مذہبی امور میں غرض طبعی یا سہل انگاری کو عمل سے

ہاتے تو مولانا ہمیں کہ بڑے لطف و مرحمت سے فرماتے اے میں کربھی اتنی میں کہ بڑا شریعت سے  
اس سے جان بچانی مشکل ہے لیکن ہم جو کچھ کرتے وہ اس بنا پر ہوتا کہ مولانا ہم کو اہم مولانا  
کو عزیز تھے۔ وہ بانٹتے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ مولانا ہم کو ناظم وینیات کی حیثیت سے نہیں  
بلکہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے عزیز تھے۔ اور مولانا بھی ہم لوگوں کو انسان ہی سمجھتے تھے۔  
اور یہی وہ رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو ایک جان و دقالب بنا رکھا تھا۔ ایک دن باتوں  
باتوں میں کہ گئے۔ میاں دوسرے مذاہب پر نذر دیتے ہیں۔ اسلام اخلاق و اعمال پر نظر رکھتا  
ہے۔ مسلمان کا ہر نعل گناہ ہے یا ثواب، اس کے بعد جاؤ، جو جی چاہے کرو۔

یونیورسٹی کے قانون کے ماتحت ناز نہ ادا کرنے پر جبر مانہ ہوتا ہے۔ جن طلباء پر جبر مانہ کی سزا  
عائد کی جاتی وہ معاف کرانے کے لئے مولانا کے پاس آتے۔ ان سے مولانا بڑے لطف و شفقت  
سے پیش آتے۔ نہ جھڑکتے نہ گھڑکتے اور نہ ان کو شرمندہ کرتے۔ باتوں باتوں میں ناز نہ ٹھمنے کے  
وجہ دریافت کرتے پھر کہتے میاں تمہارا یہ زمانہ بے فکری اور آنا دی کا بھی ہے اور پابندی  
و ریاضت کا بھی بڑے ہو گئے تو اس زمانہ کی فراغتوں یا غفلتوں کو یاد کر کے سرور یا ملول ہو گئے۔  
اس لئے موجودہ زمانہ کو غفلت میں مت گنواؤ۔ اس وقت دیکھ دو میں اپنے ماں باپ باہر سڑکوں  
سے تقویت حاصل کرتے ہو جب بڑے ہو گئے تو ماں باپ یا سرپرست کوئی نہ ہو گا اس وقت  
بھی سہارے کی ضرورت ہوگی۔ وہ ایسا وقت ہو گا جب اس سہولت سے تم کو سہارا ملے گا۔  
جو اس وقت میرے ہے۔ اس لئے اسی وقت سے خدا کا سہارا ڈھونڈو تاکہ موقع پر پھیناؤ نہ ہو۔  
جابر زمانہ معاف کیا جاتا ہے۔

کلمہ کا سرطان موت کا بہانہ بنا۔ ڈیڑھ دو سال سب کچھ کیا گیا لیکن ہوا ہی جس کا یقین  
تھا جراثیم مبعول نے کے حدود سے باہر ہو چکا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی گئی۔

ڈاکٹر، حکیم، وید، ایسٹ، اودنے سبھی سے رجوع کیا گیا۔ مرض میں تھوڑا بہت تغیر ہو جاتا تھا۔ لیکن قابل اطمینان صورت کبھی نہ بہتی۔ لاعلاج مرض اور محبوب مرض کی مسلسل نیارواری، دوا دوش، زیر باری اور ہر دم کا یہ احساس کہ اندر مہناک، انجام قریب تر آتا ہمارا ہلے۔ کیسا مستقل ذہنی کُرب ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا اس سے سابقہ ہو۔ اور خدا نہ کرے کسی کو ایسا سابقہ ہو۔

لیکن مرحوم فقے کہ اپنی مگر نرینا کھڑے فقے جیسے کوئی مجاہد نہما دشمنوں کے سامنے ہو۔ تلوار لٹ پکی ہو، زخموں سے جسم پاش پاش ہو، پیچھے دیا رہو، سوریج ڈوبنے والا ہو۔ اور موت کے پرنا سے دم بہ دم بڑھنے والی نرینہ نبواۃ نہ بہ تہہ، یہی میں خچ خچ اور جھپٹ جھپٹ کر ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے ہوں۔ دل میں خدا جانے جذبات کے کیسے کیسے مدوجزرا بھرتے ٹٹتے رہے ہوں گے۔ لیکن لبوں پر شگفتگی، آواز میں اُبد واسقامت اور آنکھوں میں دشنی جھلکنی رہی۔ ہراس و نا اُمیدی کا کوئی اثر نہیں۔ بیمار داروں کو چمکتے، ملنے والوں کو تسکین دیتے۔ نہ کڑا ہے نہ بڑا۔ ہوتے، نہ اپنی تکلیف کا خود اظہار کیا نہ دوسروں سے اس کا تذکرہ کیا۔ بگھل گئے لیکن ہلے نہیں۔

رخصارہ میں سوراخ ہو گیا تھا۔ دانتوں سے کچھ چبا نہیں سکتے فقے، صرف رفیق خدا پر دلدار تھا وہ بھی کس معیبت سے فرو کی جانی تھی۔ ایک دن میں موجود تھا، دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے جو بار بار رخصارہ کے سوراخ سے نکل جاتا تھا۔ کبھی ناک میں چڑھ جاتا، کبھی چھیدک یا کھنسی آنے لگتی تھی۔ کپڑا تر ہو رہا تھا۔ میری طبیعت بھڑاتی۔ لیکن مرحوم کے منہ سے کوئی کلمہ نالیسی یا بیاری کا نہ نکلا اور نہ ٹھکنے مارنے کا اظہار کیا۔ مشکل سے دو چار ترے دودھ کے فرو ہرٹے ہوں گے۔ لیکن مرحوم نے پیالہ اس انداز سے دلاں کیا جیسے خوب آسودہ ہو چکے ہیں۔ یہ



صرف بیمار داروں کی دل دہی کے لئے تھا۔ ہاں یاد آیا اتنا ضرور فرمایا ”یہ دن بھی گزری جائیگا۔“  
 گزشتہ عہد میں اس قابل نہیں ہے فحشہ کہ مسجد جاسکتے۔ ہنچا ہر وہاں میں ہر پانی پر دھوپ  
 میں لیٹے سانسے قین طوف کرسی اور نوٹھے دور دور تک بچھا دے گئے۔ ملنے والوں کا تانا بانہا  
 ہوتا تھا۔ جو آتا مولانا کی تکلیف اور معذوری کا خیال کر کے سلام کر کے دُور ہی بیٹھ جانا پابنہا مولانا  
 اُسے اپنے پاس بلاتے، مصافحہ کے لئے خود ہاتھ دے جاتے، ان کی گرفت میں اب بھی لڑائی تھی۔  
 پاس سے طرانا کر دیتے۔ اس وقت تک گفتگو کر لیتے تھے۔ ہر آنے والے کا غیر مقدم آنکھوں کی  
 پر معنی و پرست جنبش سے کرتے۔ لطف کے بھی دوچار کھلے کہتے۔ گھر سے کتنی بچہ آگئے تانے اُسے  
 اپنے پاس بلاتے، اس کی آرائش و زیبائش کی خاص انداز سے داد دیتے۔ خوش دلی اور خوش  
 کا اظہار کرتے اور اس کو کسی طرح یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ خود کس اذیت میں مبتلا ہیں۔

مروم کا محمول تھا کہ عہد و بقر عہد کی ناز شروع ہونے سے ذرا پہلے جگہ جگہ کھڑے ہو کر  
 تبخیروں کی تعداد اور قیام و فساد کے طوطی بتاتے تھے۔ ان کا ایک فقرہ اب بھی یاد آتا ہے۔  
 ”..... بدول ہاتھ باندھے رکوع میں چلے جاتے۔“ ہر شخص سے مصافحہ کرتے

ہزاروں آدمیوں سے گلے ملنا اور خوش دلی کا دامن نہ چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے مسکرا کر  
 آزادی اور شفقت سے گلے ملتے، ملنے میں کسی کو کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ کسی سن رسیدہ، بچیو،  
 متعسف، یا متحیر عالم دین یا صرف مولوی سے مل رہا ہے۔ بلکہ ہر شخص یہ سمجھ کر ملتا اور ملنے  
 کے بعد محسوس کرتا کہ وہ ایک اچھے آدمی اور مخلص و خوش باش دوست سے مل رہا ہے۔  
 یا مل چکا ہے۔ گزشتہ ہی عہد کا موقع تھا، حاضرین میں سے کسی صاحب نے کہا، مولانا  
 آج عہد میں آپ کو نہ دیکھ کر طبیعت بہت اداس ہوتی۔ مسکرا کر فرمایا، انشاء اللہ  
 آئندہ عہد میں اس کا موقع ملے گا۔ اس حالت میں بہت کم لوگ اس طرح کا فقرہ

بے ساختگی سے کہہ سکتے ہیں۔

مولانا کے قوی اتنے اچھے اور ان کا مزاج طبعی اتنا صحیح کہ مرض اپنے شدائد کے آخری عہد تک پہنچ گیا لیکن مرحوم کو عوارض متعلقہ میں سے کسی کا سامنا نہ ہوا کسی قسم کی اندرونی یا بیرونی تشویش نہیں پیدا ہوئی۔ مدفن اٹھتے بٹھتے چلتے پھرتے رہے۔ اور اس دم غم کے مسئلہ نہ کسی کو اس مرض کا علم نہ ہو تو وہ صرف یہ اندازہ کر سکتا۔ کہ کوئی معمولی سا چھوڑ بھینسی بنے۔ جس پر پی بندھی ہوتی ہے۔ اس عمر اور اس مرض میں نغم جسمانی کا ایسا توازن اور وقت ارادی کی غنی حیرت انگیر ہے۔

جب تک بالکل ہی صاحب فراش نہ ہو گئے۔ فرائض متعلقہ پابندی اور تنہا ہی سے بجالاتے رہے۔ ایک بار پروانس چانسلسر صاحب مولانا کو دیکھتے گئے مرض شدت پر تھا گفتگو مشہل سے کر سکتے تھے۔ زنان خانہ میں ملاقات ہوتی۔ پروانس چانسلسر صاحب نے چاہا کہ کونسلین اور ہمدردی کے الفاظ کہیں۔ مولانا نے سبقت کی اور مشرق کے جنوبی سلسلہ عمارات میں ترمیم کا نقشہ پیش کیا۔ اسی دوران میں مسجد کے بعض دیگر انتظامی مسائل بھی چھیڑے اور اس اعتماد سے گفتگو کی جیسے کوئی شخص تندرستی کی حالت میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرنا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا تو اس کے کارناموں میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ پروانس چانسلسر صاحب چلنے لگے تو چند کلمات تسکین و ہمدردی کے کہے۔ مرحوم نے ان کلمات کی قدر کی لیکن اس طور پر بالکل نہیں جیسے ڈوبنے کو تنگے کا سہارا مل جائے۔ بلکہ اس رہنمائی اور دلیری سے جیسے وہ کسی معیبت میں مبتلا ہی نہ تھے۔

مولانا سلیمان اشرف صاحب مرحوم کے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک بڑی پامردی سے گئے۔ وہاں نہ جنازہ پڑھانے کا سوال اٹھا تو اس بناء پر ہمدردی کا اظہار کیا کہ خسارہ کے زخم سے ریم آتی تھی لیکن ان کے لبثہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس ہمدردی کا کیسا شدید

مردم تھا۔ قبرستان سے اُپس ہوتے ہوئے فرمایا، اس آخری عذرت کے بحالانے کا افسوس مجھے  
سراسر اٹھ گیا!

اسطرحی ہال میں کسی کے پذیرائی کی تقریب تھی، مرض کی ابتدائی حالت تھی لیکن تکلیف  
بہت تھی۔ اس موقع پر مولانا کو سلسلہ کے افتتاح کے سلسلہ میں کلام پاک کی تلاوت کرنی تھی۔  
ہم سب نے عرض کیا کہ مولانا آپ تکلیف نہ فرمائیے، کوئی اور تلاوت کر دے گا۔ فرمایا۔  
نہیں، کوئی مضائقہ نہیں، ایسی بھی کیا تکلیف کہ کلام پاک کی چند آیات نہ تلاوت کر سکوں۔  
چنانچہ مولانا طبیکہ وقت پر اسطرحی ہال پہنچے۔ سراسر خسارہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پہرہ تکلیف سے  
تمتہا یا ہوا تھا۔ لیکن وقت آیا تو اپنا ٹھکانا لے ہوئے ڈانس پر پورے وقار اور مستندی سے  
آئے۔ آواز میں کہیں تو زلزل یا تذبذب نہ تھا۔ چند آیتیں تلاوت فرمائیں اور براہ راست گان  
والیں آگئے۔

مرض بہت کچھ بڑھ چکا تھا۔ ایک دن شام قریب تھی سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے کہ آتے  
میں ہم سب کے بیٹے و بیٹیہ شناسا ایک انعامی ٹھکانا آگئے جو مشک و عطران، بعض ادویات  
شال اور سود وغیرہ کی گشتی تجارت کرتے تھے۔ حاضرین پر ایک طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔  
خان کا غیر متوقع ایسی حالت میں آنا ہم لوگوں کو گراں گذرا۔ لیکن مولانا نے اس مضطر کو بیٹے  
لطف و مہبت کے ساتھ دور کیا۔ لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا دیا۔ مصافحہ کے بعد اشارہ سے مزاج پری  
کی اور لمحہ بعد لڑکھرائی آواز میں لیکن لطف کے ساتھ پوچھا، کیوں خان ہمارے لئے کہا لائے۔  
خان نے جواب دینے میں تامل کیا تو فرمے نہ عطران اور مشک۔ لائے ہوئے خان نے کہا۔ مولانا  
اللہ آپ کو شفا دے۔ سب کچھ حاضر کروں گا۔ مروج نے بڑے شوق سے ساری چیزیں دیکھیں۔  
اور بہت کچھ خریدیں۔ اسی لطف و شوق سے عید اکہ تہہ رستی میں کیا کرتے تھے۔

سلسل معاتب بالمخصوص بیماری کا ایک خاصہ بھی ہے۔ کہ وہ انسانی کمزوریوں کو ابھارتی ہے۔ آدمی زود رنج اور تنگ مزاج ہو جاتا ہے۔ صحت و عافیت میں جو لوگوں کی طبیعت متوازن ہوتی ہے۔ مرض و معیبت میں بالعموم یہ توازن قائم نہیں رہتا۔ میرا اور مولانا کا سلسل دن رات کا پندرہ سال تک ساتھ رہا۔ میں نے ایک دن بھی یہ نہ دیکھا کہ مولانا کسی پر برہم ہوتے ہوں۔ یا زبان سے کوئی غیر لائقہ کلمہ نکلنے دیا ہو۔ بچوں پر چھوٹوں پر، نوکروں پر، بعض نامعقول لوگوں پر آدمی کبھی نہ کبھی عقیدہ کرتا ہی ہے لیکن عجیب بات تھی کہ مولانا کبھی کسی حال میں آپس سے باہر نہیں ہوتے۔ کم سے کم میں نے ان کو کبھی اس حال میں نہ دیکھا۔ ہمیشہ سنجیدہ یا شگفتہ پائے گئے۔

اس سلسل و نمک بیماری میں وہ ہر مرحلہ سے گزرے، ہر طرح کی سختیاں جھیلیں، توفیق کے خلاف اس سلسلہ میں ان کو باپوسی ملتی ہوئی۔ سخت زہر بارہوئے، بعض صدمے بھی اٹھائے لیکن کوئی نا ملائم کدیر کسی کے خلاف کبھی نہ نکلا۔ تو اسے کبھی باپوسی یا بیماری کا اظہار نہ کیا ایک دن تکلیف زیادہ تھی، فقور طری بہت گفتگو کر لینے پر قادر تھے لیکن تکلیف کا ایسا غلبہ تھا کہ گفتگو کرنے کا بار نہ تھا۔ اتفاق سے اسی دن ایک معزز بزرگ ملنے تشریف لائے اور مولانا سے ہمدردی کی گفتگو شروع کر دی۔ مولانا نے فرمایا الحمد للہ اچھا ہوں۔ جواب میں یہ کلمہ ہمیشہ مولانا کی زبان سے نکلا۔ مزید گفتگو سہٹی تو فرمایا، دیکھئے تو کتنی عمر باقی اور کس فراغت و عزت سے زندگی بسر ہوتی۔ آخر کوئی وقت نہ آتا جب یہ دور ختم ہوتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس حال میں ہوں۔ ممکن تھا کہ اس سے بھی بدتر حالت ہوتی!

جب حالت زیادہ خراب ہوتی تو زمانہ عاز سے نکلنا ترک کر دیتا تھا۔ ملنے والے وہیں مل آیا کرتے۔ میں عرصہ سے دیکھنے نہیں گیا تھا۔ یہ میری نامعقول کردہی رہے ہیں ایسی حالت میں

کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ آدمی بھیج کر بلوایا، اندر پہنچا تو غلیبہ تھا، میں نے دروازہ دھکیٹنا چاہا اشارہ سے قریب بلوایا اب گفتگو کرنے میں بڑی دقت ہونے لگی تھی اس لئے خود میں نے کچھ نہ کہا بلکہ اندر آنکھ کے اشارہ سے پوچھا کہاں تھے۔ میں نے عرض کیا مولانا بس یونہی نہیں آنا ہوا۔ خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا، حالانکہ خیریت دریافت کرنے کی بھی جوالت نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ کوئی اطمینان بخش خبر نہ ملی اور نہ اس کی توقع ہوتی۔ لوگ جو کچھ آپس میں تذکرہ کرتے۔ اسی پر گفتگو کر لیتا تھا۔ اور چاہتا کہ یہ تذکرہ ختم ہو۔ اور کوئی دوسری بات شروع ہو جائے۔ مروج مقوڑی دیر تک خاموش میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر بڑی کد شمش سے اٹاک کر ناصاف لفظوں میں فرمایا، پریشان نہ ہو، اللہ نے چاہا تو اچھا ہو جائے گا۔

اب مجھ سے نہ ہلایا۔ میں نے بے اختیار کہنا شروع کیا۔ مولانا کیا کروں جو کچھ بس میں تھا سب کرو دیکھا۔ اب کچھ بن نہیں پڑتی اپنے بس کی چیز تو روزیہ پیسہ دوڑو صوبہ محبت، دعا تم ہی رہے۔ یہ سب بیکار ثابت ہوتے اب تو صرف دیکھتے رہنا رہ گیا ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں رہی۔ مولانا بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دیر تک پکڑے رہے۔ دامن ہاتھ خالی تھا اُسے اٹھایا اور انکشت مشاوت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ معلوم ہوا جیسے کوئی چیز گلوگیر ہے ہلکے سے کھانس کر خلاص کیا اور بے وہ دیکھتا ہے۔

میں چلا آیا۔ یہ آخری ملاقات تھی، تعطیلات میں میں پہاڑ چلا گیا۔ جس رات کو روانہ ہونے والا تھا طبیعت کا عجیب حال تھا۔ جی چاہتا تھا کہ مولانا کو آخری بار دیکھا آؤں۔ اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ اب دائمی مفارقت کی سعادت دو نہیں ہے۔ دوسری طرف اپنے بس اس کی سکت نہ پاتا تھا کہ یادداشت کی اس آخری نقش کی کسک کبھی دل سے محو کی جا سکے گی۔ دیر تک اسی جیوں میں رہا۔ بالآخر اس فیصلہ پر پہنچا کہ سلام کر ہی آؤں۔ وہاں پہنچا تو دروازہ

اور وہ تمام چیزیں، اشخاص اور یادگاریں ایک غم ناک ہجوم میں بڑھتی پھیلتی، دل و ذہن پر چھا گئیں جن سے سالہا سال سے سابقہ تھا۔ ہمت بھڑکتی گئی اور سلام کتے بغیر لوٹ آیا۔  
 تعطیلوں بعد واپس ہوا تو مرموم اپنے وطن جا چکے تھے۔ اور وہیں سے مغربہ وقت پر شاہ ایک  
 ساعت ادھر نہ ایک ساعت ادھر جوابِ رحمت میں پہنچ گئے۔

92

# مرحوم اصغر گونڈوی

انداڑ ہیں جذب اس میں سب شمع شبستان کے  
اک حسن کی دنیا سہنے خاکستر پہ مروانہ

دنیا کی بھلی یا بُری باتیں دنیا کے بھلے یا بُرے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ  
میں اسی طرح آتی ہیں، ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی  
ماں باپ بھائی بہن اوروں سے ملنے کی محبت سے آتی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں۔  
ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہوں گی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز تھیں۔  
کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جن کی ذات نے ان کو عزیز تر و گرامی تر بنا دیا تھا۔



اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے باطل میں مدرسہ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (عیدگاہی) کے ذیل سے ہوتی جنہوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرتی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے نا آشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرائی یاد اللہ تعالیٰ۔ لات کے آٹھ بجے تھے۔ مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پر تشریف لاتے۔ بیٹن گھر میں نفا سہیل صاحب کی اطلاع ہوتی تو میں بے اختیار۔ باہر آیا اور بہت سے غیر ضروریانہ فقرے کچھ ادا ہوئے کچھ پورے ورد زباں کرتا آیا اس لئے کہ میں نے مولانا سہیل صاحب بے پناہ جرئتہ گوارہ و قیصر آدھی شب تک نہیں دیکھا ہے وہ عالمہ نمکتیں اور فخرزوں کو اس لطف و وضاحت کے ساتھ ایک دورے میں سموتے ہوتے بحال و مسلسل حیرت کرتے چمے جاتے ہیں کہ طبیعت عیش کر جاتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جاتا۔ گا اس لئے میں گھر سے نیا م کو نہ نکلا تھا۔

میں چمے کہنے والا ہی تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے، کرہ چھوٹا تھا، دروازے بند اور روشنی مدھم، کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قدم و قیامت کے مقابل میں کرہ کی دستیں لحظہ لحظہ ملتی جا رہی ہیں۔ دروازہ متوسط سیم ستھری و خوش قطع پوشاک سر پہٹے سٹول بہرہ ی بھری ڈریسنگ کٹ ڈاڑھی، سر پہ بول کی اونچی ٹوپی، چہرہ پر ہمالا آنکھوں میں غلو، کی گرتی اور ہانستہ کی شگفتگی تیر میں شرافت، متوسط عمر انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی۔ بیک۔ انظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر خجل ہوئے تھے جھکا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی اور جھکنا جھٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضاء کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا۔ مسکراتا ایسا

جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ قسم ان کی شخصیت کا وجود تھا۔ ان کا مسکرانا لب و لہجہ کا مسکرانا تھا۔ بلکہ ہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں نے تکلف ہی نہیں گندخ بھی تھا۔ مولانا بولے، ملو ایک انسان لایا ہوں میں نے کہا شکریہ ہے آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ کسی انسان کا وقتاً فوقتاً مہنا بہت ضروری ہے۔ بولے ملو۔ ملو۔ اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل لگ کر چلے گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت اور رحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اسے اس طور پر اٹھا لیا جیسے میرے ہاتھ اسے پیچنے والے تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنہٹنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سُنو اصغر صاحب کا ایک شعر سننا تاہوں۔ ابھی شعر کی بارہی نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب بس کسر یہ رہ گئی۔ کہ ذکر نہیں ہیں ورنہ دیکھتے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترغیم سے ہشتیہ وردی کے نہیں بلکہ فیملے مانسول کے ترغیم میں پڑھا۔

زندہ جزو نہ اٹھائیں وہی ساغریں جہاں سے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی نجبان بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذکر صاحب اچھے شعر سن کر نہتی اور اچھوتی دنیا میں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے اور مثال پر

مجھے بھروسہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوتا ہے  
 میں نے کہا مولانا شعر پڑھے مرنے کا ہوتے بلکہ اسے جس کی ویسٹر پڑھ کر اور لوٹا ہاتھ میں  
 لے کر عمارت نہ کیجئے۔ سب لوگ اطمینان سے بیٹھے، کھانا آیا مولانا نے فرمایا اصغر صاحب  
 ذرا روح نشاؤ ترکالنا، ان کو اشعار سنائیں میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔  
 جاڑا پڑا ہلے انگلی تھی تھی ہے۔ کھانا کھا کر چلتے کا ویر ہو گا۔ پھر بھوٹ سچ ملایا جائیگا۔  
 آپ تو اشعار کا میہار کرتے ہیں۔ اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی  
 ہے۔ آپ کا کیا نہ دنیا کے قابل نہ جھٹکے کے قاتل! مولانا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ  
 رکھ کر مہینے دوڑوں پاؤں گھٹنے سے رو کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے بھولا سا بھولنے لگے۔ یہ  
 مولانا کے ابتناج و اہتران کی خاص علامت ہے۔

۱ ناظرین معاف فرمائیں، ابتناج و اہتران ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی  
 اور ضرورت نال ہوتا لیکن جب بھلے مانس اور سمجھدار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں۔ خواہ  
 غیر مانس ان کے بحال و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔  
 جاہلوں اور لیٹہ دل کے اس دور میں دقیق یا نازک معنوم کو موزوں و مکمل الفاظ سے  
 ادا کرنے کو ترس گیا۔ اہلوں کو کون سمجھاتے کہ صاحب ذوق عربی، فارسی یا کسی اور زبان  
 کے الفاظ قابلیت کی نشاں یا تعصب کی بنا پر نہیں کہتے۔ بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے  
 منع کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ عوام یا لیٹہ کی سمجھ میں وہ لفظ نہ آتے تو ہم خوش اور مبار  
 خدا خوش۔ ہم کب کب چاہتے ہیں کہ آپ نہ سمجھتی اور جاہلی بھی ہوں اور میرے جاہلوں  
 سے کھینچتی بھی نہ سمجھتی ہیں۔

۲ عوام کو خوش کرنا بڑے ڈرامہ کی بات ہے لیکن کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب

ہم اپنا اور اپنوں کا جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر چاف اوٹھ کر لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گزرنے کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی کے خافی ہونے کا غم۔ آواز دی اندر سے ہاں آگئے انگلیٹھی سر دہونے لگی۔ نوکرینے کو تھکے ڈال دتے۔ نہ اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب کے آنے کا خطر۔ نیند آتی سو گئے جی چاہا بستر ہی پر فقص کرنے لگے۔

مولانا سیل نے فرمایا اچھا صغر صاحب روح نشا تو نہ کالتے مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ آپ کو تو یونہی سب کچھ محظوظ ہے۔ میں نے کہا مولانا ذرا اظہر ہے ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اتر رہے۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا جلدی کیجئے ورنہ پھندا لگنے کا اندیشہ ہے میں نے کہا رند نے طرف تو اٹھایا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد بیٹھے اور میخانے بٹنے کا سوال آئے گا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ صغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ متنازع یوسفی مسلم لیکن عام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں۔ وہاں صغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ صغر صاحب منہں پڑے کہنے لگے رشید صاحب ساغر و میخانہ کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے۔ کلال پیدا کرتے ہیں شاعر ذہن شرافت و شہادت کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے۔ علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کی۔ کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتائیے مولانا سیل کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہنے لگے ان کی نہ پوچھتے تمام عمر میخانہ میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔

میں نے کہا معتب ہی نہیں گواہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ لکالے گتے ہوتے تو یقیناً زندہ ہوتے مولانا بولے لکالاجاتا تو غنہارا کیا حشر ہوتا میں نے کہا اسی جواب اصغر صاحب کا ہے۔ اس پر مولانا اور اصغر صاحب دونوں نے فغغہ لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاط مارچ کا ایک نمبر بڑی محبت دیا کئی دن بعد مرحوم نے پوچھا آپ نے نشاط مارچ کا مطالعہ بھی کیا میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت ملنا سہیل مہجوب میں ہیں آپ خود کچھ متفرق اشعار بتائیے شیخ صاحب نے بے دریاں بچے شمس کے لطف اٹھائے میں نے تیا سوچنے کو پڑیں لکھتا ہے وہ دیکھتے معاملہ کے بچا کپ پر کسی بڑا انخس سے الجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہو گا جو افلاطون و ارسطو سے کرنا چاہتے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا متفرق اشعار نہ سناؤں گا پوری بغل منسنے شاعر کو اسی طرح سننا چاہتے تصور سے بہکنار ہو جتے تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ بغل منسانی۔ کب سارم تکمیل گوارا لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گرمی ہر دور کی بول بولی	تمام شبہ ہاتے طلسم بے سببی
گزر گئی ترے ستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی	نہ کہ کشاں نہ شیا نہ خوشہ عینی
یہ زندگی ہے یہی اہل علم و حکمت ہے	جمال دوست و شبہ و بادۂ عینی
ذریعہ حسن سے تیرے چمک اُتی ہر شے	اد اور رسم ہلالی و سر زہر لہری
مرثت عشق طلبہ ار حسن بے پایاں	حصول تشہ لہی بے شدید تشہ لہی
ہیں عے عشق نے بھی شہر شمس اُڑائی ہیں	ہماں سے نور نے تو غنہ ہاتے زیر لہی

کشش نہ جام نگاریں کی پوچھا اے ساقی  
جھک رہا ہے مرا آب و رنگ تشہ لہی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لئے پڑتے لیکن نو میڈیکل ہسپتال میں مدد تو مل صاحب فرانش رہا اس زمانہ میں اعظم صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اقلاد کو میں ہسپتال کے بالاعلانہ پر اپنے کمرہ کے قریب بھیک فوٹے دن کو ایک خاص آہٹ سنتا۔ دروازہ کھلتا۔ اعظم صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہواوت مدوں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہونے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر باجسوس کر کے خوش ہو رہے ہیں سلام علیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوش خبری سن رہے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے۔ کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لبا سفر کر کے نہیں آتے تھے۔ بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آتے تھے۔ میری طرف بھی آنکھیں باتیں ایسی بھیڑتے جن کا تعلق دور دور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون شیطان کی آنت شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا۔ اعظم صاحب یہ آپ مجھے الہ آباد سے بہال قبول آتے ہیں۔ اور رحمت وزیر باری اللہ نے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا کر بوسے شیطان کی آنت کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی اذرا پاؤں شتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سنا ہوگا۔ میں نے کہا اعظم صاحب تکلیف نہ ہو تو کچھ سنائیے اعظم صاحب میری اس (غالباً غیر متوقع) فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بٹھے لطف سے سنائی۔

سرگرم تجلی ہوئے جلوۂ جاہانہ	اڑ جاتے دھواں بن کر کہیہ ہو کہ بت خانہ
بیردین ہو دینا ہے یکسر وہ بت خانہ	اک اور قدم بٹھ کر اسے بہت مروانہ
قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی	تو صورت مستی ہے تو مستی میں خانہ
اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اُس نے مختلف کو	اک تار شامی سے الجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمی سن شمع اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غم پروانہ  
 زائد کو تعجب ہے صوفی کو تختہ ہے صدرِ شکِ طریقت کی یہ لغزش مستانہ  
 اک قطرہ شبنم پر نورِ شید ہے عکس آرا یہ عیسیٰ و ہستی افسانہ ہے افسانہ  
 انداز میں جذبِ اس میں سب شمعِ شبتان کے  
 اک سن کی دنیا ہے خاکِ سر پر دانہ

گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر واپس جانیے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ لیل ہی  
 باہر جا رہے ہیں۔ جب میں محنتِ یاب ہو کر واپس آ گیا۔ تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلہ  
 میں میں نے پوچھا کیوں اعمر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی  
 شگفتگی کیوں طاری رہتی میں نے آپ کو اخلاقی کبھی فخر مند نہ پایا کیا میری بہت افزائی معذور  
 تھی۔ بڑے بالکل نہیں اچھا شخصتے ایک لطیفہ سنانا ہوں۔

ایک دن میں اکٹومی سے مکان واپس آ رہا تھا . . . . . صاحبِ راستہ میں  
 ملے اور نہایت غم ناک لہجہ میں بولے۔ اعمر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے۔ رشید صاحب کا  
 انتقال ہو گیا ایسے تھے ویسے تھے۔ میں سن کر منس پڑا اور بولا سفرِ عزاس کی باتیں کیجئے قتال  
 کرنا کیسا۔ میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہو کر رہیں گے۔ انہوں نے مجھے بدحواس  
 یا بیوقوف سمجھا اور بگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے گئے میں نے کہا یہ سب صحیح لیکن میں  
 ہرگز نہ دیکھ آتا ہوں ان کی پیشانی پر نہایت عجیب نقوش میں تھیں لکھی ہوئی تھیں وہ زمانے۔  
 میں نے کہا آپ نہیں ملتے تو آتیے تار سے کر دیانت کر لیں۔ پونا پنہ ایسا ہی کیا گیا اور خبر غلط  
 نکلی۔ رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب انھوں نے آپ کو دیکھا تو فرما یز نظر آتا کہ زندگی  
 اپنی پوری تالیف و تازگی کے ساتھ موجود ہے۔ اور میں مسرور و مطمئن ہو جاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا۔ انہیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا اثر میں فرق نہ آتا۔ وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے ممتاز و محبوب رہتے۔ وہ کچھ عالم مقبرہ تھے لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے۔ بڑی رساطبعیت تھی۔ نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی نہ تک اس سہولت اور صفاتی سے پہنچ جاتے۔ کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے ان کا یہ سابقہ پہلے ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اور نہ فن تنقید کے بہترین اصول سے آشنا تھے۔ لیکن ہندوستانی الہیاتی کے میٹر ادبی کی حیثیت سے ان امور سے ساقیہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن استدلال و لوٹ تنقید میں نکلیں۔ اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا ہے مسلمان اور مشرقی تھے۔ لیکن میں نے بڑے بڑے مغربیت بابوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معرّفہ پایا۔ اردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لئے شعور و ذرا انداز سے کام نہیں لیتے تھے۔ اردو کے اکثر مستند اہل قلم بھی الف لیلہ کے بکبارہ سے ملنے جلتے ہیں۔ بات انتہی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو مہرج نہیں۔ لکھیں گے اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں، ہندو مارے ڈالتا ہے، یا محبوب بھاگ گئی ہے، مروج تحریر و تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس آباد کی فرمائش پر انہوں نے "محققوں" کا ایک سلسلہ عجل کے لئے تصنیف کیا جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دل نشیں انداز سے روشناس کرایا ہے۔ کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور رقیع سمجھے جاتے ہیں۔



مروم نے ایک مستقل تصنیف اردو کی ذہنی تالیف ”شروع کی ہفتی“ کئی صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڑبڑ ہو گئے ہیں۔ اور حواشی اس کثرت سے لکھے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اعجاز صاحب کی آمدنی بہت کم تھی لیکن میں نے ان کو کبھی تنگ دستی کا شکی نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا۔ بہت اچھا پہنتے تھے اس سے اچھا کھاتے تھے۔ اپنی معیشت سے زیادہ مدارات کرتے تھے۔

ان سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے ان جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ ان کے جسم پر یا گھڑ میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی۔ جس سے شبہ بھی ہو سکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا قیسے درجہ کے بدل پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔

آج تک میلے اور پونڈ لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیا یا نحیف فقرے زبان سے نہ نکالتے۔ گفتگو آہستہ کرتے مسکرا کر کرتے لہجہ مہذبہ نرم پر وقار یا شگفتہ مہزنا میں نے ان کو کبھی مابیس، مصل یا مضطرب نہ پایا ان کے ملنے والے مختلف یا منفرد مشرب کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی دفع بھی ہاتھ سے نہ جاتی۔ اور دوسرا بھی مایوس یا منغص نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انہوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے ذیل میں لب سڑک علیا تھا۔ بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش، تین چار گاؤں تیکھے، الماریوں پر روشن دیوار پر تعلی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا، کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان چمے یا بیچم اجل خاں کا مطلب۔ خدا کے لئے اس جگہ کو چھوڑ بیٹے۔ لوگ بیٹھے ہوں نہ شبہ ہو کہ یا تو مضمون، امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھوڑے پر چڑھ لگانے سے فائدہ؟ مجھے تعجب ہے اسے آپس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک جملہ قبول نہیں کس مایا۔ اگر سبیلہ چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہر میوہ تھیک دوڑوں کا کاروبار

کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب منہیں پڑے لڑایا آپ نے بات ٹھیک کسی مجھے صفائی بہت پسند ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظریہ صفائی خود مجھے لھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اُسے فوراً خریدتے، دوستوں کو دکھاتی جاتی۔ کوئی پسند کر لیتا تو اُسی کے نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے شامیت باریک اور حسین نقشے کی سیلنی لاسے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔ سیلنی دکھاتی پوچھا کتنے کیسی پیسے میں نے کہا ہشتادو پینے مشوہ فتومات میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں، فتومات کا یہاں کیا گند میں نہ ملا نہ انگریز ہوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے، میں نے پوچھا کیا قیمت دی کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے سنا نہیں۔

جرم کچھ کہا کہ تراشٹن ہو گیا احمد دودا!

بس یہ آپ کی نذر ہے۔ وہ سیلنی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اب مجھے جب کبھی نظر آ جاتی ہے تو اُسے منجھاتا ہوں۔ اُسی میں کھانا منگوا کر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہو چکی ہیں۔ نقوش دھندلے ہو گئے ہیں۔ میں حاذقہ کا کچا ہوں۔ لیکن تاخیرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان ٹٹنے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور جاننے والے جانتے ہیں، بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے تو ماضی کے سیمائی پروں پر رنگ و آمیز نگ خط و خال روحانی وزیریائی کے کیسے کیسے حزیں و حسین نقشے بن کر ٹٹتے ہیں اور سٹ سٹ کر ٹپتے ہیں!

اصغر صاحب کھلانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے، مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا۔ پہلا عملہ سہنے کو سہرے گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔ آخر آخر میں والد آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلو بلڈیر

کے احاطہ میں ایک مکان گرا دیے گیا تھا۔ مکان کے احاطہ کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا پھلا گیا تھا۔ میلانہ آباد پہنچنے کا وقت متعین تھا۔ میں نے ہمیشہ انتظار میں رہا اس طویل سڑک پر ٹھلٹھلے ہوئے پایا۔ اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ پہلے حسرت آڑا پا جامہ پہنتے تھے۔ بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرتہ، سرسپید لڑپی ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈمبیہ تھوا، دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار سگریٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکا گئے قدم نبھالتے ٹھلٹھلے ہوتے۔ مجھے آنا دیکھ کر باغ باغ ہنر جاتے ہاتے ان کا باغ باغ ہونا زبان سے مرجایا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی سپک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اُترتی معلوم ہوتی۔ بولیں پرسکسٹ اور باتوں میں شگومان کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دینے۔ لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ وزمرہ سے معلوم ہوتے۔

ان کی باتیں قصوری بہت اب تک یاد ہیں۔ کتنے رشید صاحب مٹنا۔ سب سے بیمار ہوا بول ذرا زیادہ عجیب نش ہو گیا ہوں۔ ہر طرح کے بان تبا کو ذرا ہم رکھنا ہوں یہ دیکھتے ہر ناک کا سگریٹ ہے۔ ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ ان میں وہی لطف آتا ہے جو معمولی اجباب کی محبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرنے کے مے مکان پہنچتے۔ لڑکے کو آواز دیتے۔ ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لبتے میں نے ہارکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے۔ یہ آؤ لیٹن کا کلاس ہے۔ یہ فورس ہے اور ہاں آپ نے کوونٹر کے مکھن کھائے ہیں۔ ذرا یہ پسین بھی ملا وسط فرمائیے۔ غرضیکہ ہر چیز بڑے شوق و لطف سے پیش کرتے پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائیگا مدقوں سے ہانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں آج سے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چیت پائیں گے۔ یہ مرغ مسلم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا رہنے۔ آپ علی گڑھ کے ہالوں کا پراپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا متبادل نہ کرنا ہو گا۔ یہ برقی قوام ہے وہ معمر فی پتی ہے اور ہاں روڈ کر کو آواز دے کر ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم صاحب نے دی ہیں کہتے تھے ان کے مورث اعلیٰ نے شاہان اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کر دیا تھا اس کا نام آبرو سے اودھ ہے اسے ضرور سچتے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑے گا۔ کہنے لگے لیتے جاسیے جس کی آبرو خطر سے ہیں دیکھئے گا دے دیجئے گا۔

پسب کچھ تھا لیکن میں شرب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطف بیان میرے لیا تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں انہیں کو المضاعف کر کے اور غواڑ کر پیش کر رہے تھے۔ اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے ان کی اس حکمت علی کو فاش کرنے کی بہت نہ ہوتی تھی۔ اور وہوں کی فصل ہوتی تو اس کا ایک ٹوکرا ساتھ کر دیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجئے تھے معلوم ہوا کہ وہ آج کل موجود نہیں ہیں۔ زیادہ تو میں نے رکھ لئے۔ کچھ آپ لیتے جاسیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی تو بڑے نہیں بھی بھیج دیجئے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے علی گڑھ آ رہے تھے۔ راستہ میں چند گھنٹوں کے لئے الہ آباد میں اصغر صاحب کے ہاں ٹھہر گئے۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا۔ مرحوم کو بچہ کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلے اور لکڑی کے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے۔ اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر ان کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے۔ کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے پھار پاتی پرسنل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کر دی تھی۔ ہفتوں بعد چار پاتی

سے اٹھتے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہو گئے تھے۔ بہتر لوگوں نے سمجھا یا اور نوکرنے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اُتارا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ کو گود ہی میں لے لے واپس ہوئے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلنے رہے حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے مال تک بلانے نہ دیا۔

کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا بولے رشید صاحب آپ تو دیکھ چکے ہو (دوست کا بچہ) کتنا خوبصورت معصوم اور پیارا بچہ ہے آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بتو سے مجھے کتنی اُلفت ہے اور اس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا۔ اول تو میں بقول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں۔ دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز نپلا پیدا ہوا کہ احمد بتو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے۔ ذرا میری بدحواسی تو دیکھتے ہیں نے بتو کے والدین سے بھی کہہ دیا۔ کہ احمد نے بتو کو زیر کر دیا۔ چنانچہ جس فاختہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاختہ فخر و مباہات سے واپس آیا۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی۔

ایک بار خط آیا لکھا تھا بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں۔ دیکھتے کیا انجام ہو؟

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے مرحوم اسے جانتے تھے۔ جب کبھی ملا بلو جاتا تو وہ پتہ رکھتے ہوئے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں۔ اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و رواج پیدا کرتے مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کرتے۔ ایک بار ایسے ہی ایک مجھے لے گئے۔ مانگ سے نہ زیادہ خود ہر گلاب کی تعریف کرتے۔ گلاب یوں ہی سے تھے۔ میں نے اعلاناً ایک آدھ کی ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کر دی۔ مگر صاف سب نے اسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کئے۔

میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا۔ اصغر صاحب فکر نہ کیجئے سب کے سب معمولی درجہ کے ہیں۔ مرحوم کو غیر معمولی مایوسی ہوتی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چپ کیسے ہو گئے۔ کہنے لگے کیا کہوں ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعلوم ہونے کا بڑا شہرہ سُنا تھا۔ گلابوں کے بارہ میں تو آپ نے فیصلہ کر دیا۔ نامعلوم ہونے کا حال مجھ سے پوچھتے۔ کم بخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا۔ . . . . صاحب (اللہ آباد کے سب سے محنت دار آدمی) کی معرفت اسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے۔ اللہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کرے گا۔ ٹھیک ہے ایسے نسل آدمی کے گلاب کیونکر ملدہ ہو سکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعات پر ہے کہ میں جانوں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا۔ رام ختم ہو جانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری سلامت کے زمانہ میں میرا انا اللہ آباد میں صبح پانچ بجے شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں ہی ام کروں۔ مہراہم در طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام میں پہلنا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کئی ہرج نہ ہو گا۔ صبح چلے جاتے گا میں ایسا نبت کہ نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔

مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ جس سے ان کا پرالیا معلوم بھیجے مرحوم کے پرے پر پہنچ گئی لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس محنت سے آیا تو پھر آپ کی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات غصرت ہو جاتی ہے۔ اور اپنے اور پلعت میں جاتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن

مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی امید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملاحت اور دوسروں کی محنت کا ہدف بن کر کبھی اور میں اعترف صاحب مرحوم کی روح کا سامنا کرنے کی ہمت ہو سکے۔

دوسری ایک روز کے اندر اندر تیار کیا کہ اعترف صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلوئیر کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے نصعت ہو چکا تھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب لڑٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شفقت کی سراسر میں خلا پیدا ہو گیا۔ ایسا خلا جس میں بی بانی بنستانی ہوا دل اور گورستانی سنائوں کے کچھ اور نہ تھا۔ اب ہم تن مشوق ہو کر میرا کون انتظار کرے گا۔ میری تحریروں پر کس کو رسد آئے گا۔ اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سنا پھرے گا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہو تا سب سے پہلے اعترف صاحب کا سنائشی خط آتا۔ اعترف صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرور کر دیا۔ میرے اچھے یا بُرے خیالات کا بغیر مضمون لکھنے کو دوران میں مجھے شان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اعترف صاحب اس کی داد دیں گے۔ اور لکھو بہتر لکھو اور جلد لکھو کی انگ پید ا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں۔ جن کے بارہ میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شاید اس کی تہنک لوگ نہ سچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اعترف صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے اور دیتے اور ملاقات

ہوتی تو سب سے پہلے اسی پر گفتگو کرتے۔

اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا صاحبِ فکر و سیریل باادگار میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص کے ہمیدہ ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرا ہاں مطلب صرف اس شخص تک ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و مقصودات سے محروم کو کھتی۔ اور جن کے خفیف سے خفیف ارتعاش بھی ان کے ذہن و دماغ پر متعم ہو جاتے۔ فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ جن پر وہ محض اس وجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کر لی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے پنکوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ معرصا صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو لیکن زندہ رہنے کے اور یہی گزریں زندہ رہنے میں ارادہ کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مروتوں کا نہیں۔ البتہ بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نہ ٹپٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ محروم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مل رہے تھے۔ سب لوگ منہں بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور ایک سخت حملہ ہوا۔ اور چند لمحوں کے بعد اس کے عالم میں رہ کر پیشگی میں مل گئے۔



اصغر صاحب زندگی کے ہر شیب و فراز سے گزر رہے تھے۔ ہر قسم کی محبتیں دیکھی تھیں۔ لیکن انہوں نے خرد واری اور بانچن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا وہ کچھ اور ہونے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اور باش، قلندر، اور باب علم و فکر صاحب باطن، اور باب ودل بکواسی و بے بہرہ، طالب علم، کاروباری لوگ میں نے ہر ایک کو ان کو قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنہوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جودہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو کھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔

اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے جن کی قابلیت اور شخصیت مستحکم تھے وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں یا فالتوں میں ہوتی ہے کہ ان کے سامنے رہتے تو سب کچھ بعد میں کچھ نہیں مرحوم لتخیر نہیں کرتے تھے بلکہ لوگ خود ان کی الفت و اخلاص کی منزلت کو ناعزیز رکھتے تھے۔

ان میں ایک خاص نوعیت کی بڑائی تھی۔ جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا! جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا، شعر خوانی اور شعر سرائی ہو رہی تھی۔ اصغر صاحب کی باری آتی مرحوم کی آواز طبعاً آہستہ تھی۔ شعر پڑھتے شروع کرتے تو مجمع میں اشتباہ پیدا ہوتا۔ مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک۔ ایک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سنانے شروع کر دیے۔ ایک شعر پڑا یہ گویا ہے۔

زلا لتخیر کردم این جہانے سر و انجم را  
ز جوش بندگی پروردگارے کردہ امیبدا

میں جانتا ہوں مرشد کا یا معطراری فعل کس راوی کی غمازی کر رہا تھا اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا وجہ ہوتا ہے ان کے پندہی اضطراری آسوں نے علی گڑھ کی آبرورکھی۔ اور جاسم کو جاسم بنا دیا اور سب نول میں ایک نژاد کو کی طرح ڈالی۔

اصغر صاحب مشاعر میں سے بیزار تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ طالب علموں کی محنت رد کرنا گناہ ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ قصور سہارا ہے ہم میں نظر و فحکمی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی مقل ہو سکتے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے بڑھے کرٹھنے تھے لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے مگر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کرو، انا تم کو بیس پڑے گا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند قانع اور سادہ مزاج شاعر کم دیکھنے میں آتے جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پرانے زمانہ میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے۔ بائیں بہ جگر صاحب ایسا نہ لپٹ آدمی بھی کم ملے گا۔

جاہ و شہرت سے محروم ہر نا جانتے ہی نہیں۔ اپنی اس افتاد طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کر دیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدقوں سے عالم ہوش میں ہیں اور پھلپھل عادت ایک قلم ترک کر دی ہے۔ میں نے ان کو انتہائی از خود رفتاری کے عالم میں دیکھا ہے۔ اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو محنت محنت کہتے سنا لیکن اصغر صاحب نام آتے ہی ان کو یا تو سداٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھانسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی لغز و لغز کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس پر غور

ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ بینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گزرتے تھے لیکن میں نے ہر جگہ ان کی زبان سے ناقدوں کو یہ لفظ کتنے نہ سنا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مفصل اور سمجھ دیوں۔ خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کہہ دیاں اٹھ جاتیں تو دنیا آتش لال محض ہو کر رہ جاتے۔ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتاد طبع کا اجتناب کتے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں۔ اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ بڑے غزل گویوں نے کیا غزلیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اچھے غزل گو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں اور پھیلا سکتے ہیں۔

مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مد نظر رکھ کر شعر نہیں کہتا اس کو کیا کروں کہ بلند گہرے نازک اور لطیف خیالات خود بخود غزل کے قالب میں محصل جاتے ہیں۔ کاش میرے خیالات و احساسات کو تو دوسرا پیکر اختیار کر لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلا تیں۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا اصغر صاحب آپ تو جتنے اور عجیبے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ غزل میں صرف اول درجے کے اشعار تو رہنے دیا کیجئے بغینہ کو حذف کر دیکجئے۔ اصغر صاحب ہر ایک بھر بھری سی طاری ہوئی پہلو بدل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا ارشید صاحب آپ نے کیا بات کی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر کبھی دوسرے درجے کی بات کہتا ہے؟ کہ ا بھی سکتا ہے؟ وہ تو ہمیشہ اول ہی درجے کے شعر کہتا ہے۔ سنئے دالے کے نزدیک وہ اول درجے

کا ہو یا دم درجہ کا۔ اس سے شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو مہربان شاعر نے اسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہو گئی۔ بہت بڑی کچھ دن اور گزریں تو یہ حقیقت آپ پر غور فرما کر ہو جائے گی۔

اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔ کہتے تھے زندگی نے وفانہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے۔ فرمایا ہم میں ایسے نقاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ اردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا تذکرہ نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہو جائے۔ بڑے بُت شکن تھے کچھ دن اور جتنے ہوتے تو کیا صلح توفیق الہی انہیں بلا کر نہ دیتی۔ سرسبز و کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کہتے تھے سرسبز و کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں چسوس ہوتا ہے کہ کسی حال میں نہ اپنی سطح سے اتریں گے نہ سامعین میں سے کسی کو اس کی حدود سے گزرنے دیں گے اردو مہندی کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سرسبز و او پندت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اردو سے برہائے اعدا لغت ہے۔ دونوں میں ٹپانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔

اونچی جماعتوں کے مختلف الحینال طلباء اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے۔ تعجب ہوتا کہ یہ فوجران جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں میں نے مرحوم سے ایک دفعہ اس کی وجہ پوچھی بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں مہر علم کے تار و پود ایک دوسرے میں ملے ہوئے ہیں۔ ایک ہی علم کی تشکیل مختلف علوم یعنی مختلف محکموں سے ہوتی ہے۔ پھر آپ تو جانتے ہیں کہ نبی اور اخباری علم (مسکد اکبر) بزرگوں کے تصرف کا عبیدہ مناج دہے گا۔ جب علم انڈیا اور علم نابا ب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں

نکتہ جاسکتے۔

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ عمل نہیں لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو ان کی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر بھی پڑنا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آتا ہے۔ اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آکر بوجھوتے ہیں ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحویل کیجئے تو ان کا کلام!

کلام سامنے آ جانے سے مقصد ان کا شمار کیا جاتا نہیں ہے۔ بلکہ وہ جمال و کمال اور قصوت کی وہ مینا کاری و فروز آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لانا ہے۔ ان کا کلام انہیں کی طرح محبت کرنے والا، رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فخر کی زحمت نہیں دیتے۔ یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فخر کے رنگین و رحمان نقوش سے آپ کی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلہ میں محض انہماق نفیس کی خاطر میںვნما اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے محکم طاقی کے کوہ نذا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لاٹھائیں گے۔ اور آپ سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہوں گے اقبال آپ کو سرسبز اور دھوا دھندلہ نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے۔ اقبال کے ہاں شمع فخر و تقیم اور دعوت عمل ہے۔ اصغر کے ہاں تصویرات جمیل اور دعوت دیدہ۔ اقبال حکمران کرتے ہیں اور اور اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ منوی شمیم سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے ذوق مست کے انہماق (ترصیع) میں دونوں انتہائی امتیاز اور مصداق کاری

کو نزل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو نالغہ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی بھی سلیقہ و شرافت اور صداقت میں گوری۔ ظاہر ہے یہی رنگ ان کے کلام کا بھی ہو گا۔ اصغر سزا سزا نزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں سزا کی مروجہ یا سزا پرانی یا سزا کا رسی نہ ملے گی۔ آپ ان کا کلام بہت کلف جس کے سامنے چاہیں پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برنایا ہے۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے۔ بلکہ ان کی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی فحشیں اور ان کی ذمہ داریاں۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے۔ کیا فی یا نقیباتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ اور عارفانہ تحلیل۔ پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ کی کیف و کم رنگ و آہنگ کے ایسے خالص میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خود عمال نظر آتا ہے۔ عارفانہ تعبیر اور شاعرانہ صداقت کا یہی کام ہے۔

اصغر محرم کے شاعر نہیں ہیں ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اٹھانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ آپ تقوڑے بہت طعمے پڑھ بھلے مانسوں میں بیٹھے اور فوق و بصیرت رکھتے ہوں۔ شاعر کی یہ دنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے اگرچہ یہ اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا تصور نہیں ہے۔ قصور اس مختصر اور معیار کا ہے۔ جس کے واضح و مستند مزاج!

۷ اصغر صاحب اپنے کلام کی حنیت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے!

11A

# ایوب

## غمگاری نیکیاں زندہ غمگاری خوبیاں باقی

ایوبؑ مرحوم کے بارے میں کیا کہوں کیونکہ کہوں اور کہاں سے شروع کروں وہ اتنے اچھے تھے اور اتنے ناگزیر تھے کہ ان کے بارے میں کچھ کہنا شروع کروں تو سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نہیں وہ۔ یہاں سے نہیں وہاں سے۔ ابھی نہیں آگئے چل کر۔ یوں نہیں دوں۔

وہ موجود تھے توان کی مثال ناسم فطرت کی تھی۔ مثلاً ہوا پانی۔ روشنی جو اس درجہ عام و ارزاں ہیں کہ ان کی طرف توجہ مائل نہیں ہوتی۔ لیکن ان میں سے کسی میں کہیں سے کوئی فرق آجائے تو پھر دیکھتے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور یہی ناقابل التفات نعمتیں کیسی نعمتیں بن جاتی ہیں۔

ایوبؑ ایسے ہی تھے وہ دوسروں کی زندگی میں اس طرح اور اس درجہ گھل مل گئے تھے کہ ہم



سے رخصت ہو گئے تو ہم میں سے ہر ایک نے یہ محسوس کیا کہ ہر چیز ناقابل التفات حد تک ارزاں و عام تھی۔ وہی ناقابل بیان حد تک اچھی ضروری اور نایاب بھی تھی۔

ہم سب کی زندگیوں میں مرحوم کے گھل مل جانے کا لازمی نفا کہ ان میں بظاہر کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ وہ غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہ تھے۔ دولت مند نہ تھے۔ کچھ بہت ذہین بھی نہ تھے۔ نہ انہیں کوڑ بڑا نام تھا۔ نہ خوش پوشاک۔ نہ خوش گفتار۔ نہ خوش باش۔ نہ رنگین و رعنا۔ وہ معمولی آدمیوں سے بھی زیادہ معمولی تھے۔ پھر بھی وہ ایسے تھے کہ اب ہم میں ویسا کوئی نہیں اور ذاب و حود نہ تھے سے بھی کوئی ایسا ملے :

سیاہ نام، چمپک روپست قدر نحیف الجثہ۔ پہلے پہل کوئی دیکھ تو مسہ پھیرے۔ برتے تو غلام بن جاتے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ لیڈب کی خوبیوں نے ان کی بد صورتی کو کس درجہ بدل کر یز بنادیا تھا۔ فطرت اپنی چوک کی بسا اوقات کسی بے دریغ بخشی سے تلافی کرتی ہے میری ہی نہیں۔ میرے عزیزوں اور دوستوں کی بھی ان سے بڑی پُرانی ملاقات چلی آتی تھی۔ اور میں نہیں بتا سکتا کہ کہ ہم سب کی زندگی میں ایوب کس قدر خوبل تھے اور ان کی موت نے ہم سب کو کیسا ہمتیار و ملایوس کس درجہ بے دست و پا کر دیا۔ وہ میرے ہی دیار کے تھے اور ایک بٹھے ہی ستند شریف۔ ذی علم اور صاحب خیر گھرنے کے چشم و چراغ تھے۔ میں علی گڑھ میں تھروڈایر میں تھا جب لیڈب فرسٹ ایر میں داخل ہوتے۔ بی اے ایل ایل بی ہو کر پروسٹ آفس میں ملازمت کر لی۔ اور علی گڑھ ہی میں رہیں گئے۔

اسکول کی تعلیم کے دوران میں وہ میرے عزیز دل و خور و دل کے ہم سبق تھے۔ علی گڑھ میں آئے تو ہم سب ایک ہو گئے۔ اور ستر و اٹھارہ سال تک ہر رنج و راحت میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ یہ تو تھے میرے ذاتی تعلقات۔ اسی قسم اور اسی درجہ کے تعلقات مرحوم کے کاروں

سے بھی تھے اور سب جانتے ہیں کہ ان کی ہمدانی کا جہاں مجھے پہننے اس سے کم دوسروں کو نہیں پہننے  
خدا ہی بہت جاننا ہوئے۔ اس پکڑتھیر میں دل سوزی دُخ و پراسی کا کبسا بیکراں و بیش قیمت خزانہ  
و دل بیت بختا۔

مجھ پر، میرے بچوں پر، میرے دوستوں پر اور میرے خاندان پر جان چھڑکتے تھے۔ نوشی کی بات ہو  
تو ایوب صاحب سب سے پہلے موجود اور سب سے زیادہ خوش، رنج و ترو کا موقع ہو تو سب  
سے پہلے حاضر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے یا ہر شخص کی خوشامد کر  
رہے ہیں۔ نوشی میں ہر طرح کے جملے فقرے سر کر رہے ہیں۔ اور اپنی سرت کا طرح طرح سے اظہار  
کر رہے ہیں۔ رنج و بالوسی کا موقع ہو تو ایک حرف زبان پر نہیں نہ تسکین کا نہ تقویت کا۔  
چپ چاپ بیٹھے سر لگا کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یا محبت و مہربانی سے بے اعتیاد ہو ہو کر سہ  
تک رہے ہیں۔ ذرا بھی اتمال ہوا کہ کسی کا آنا یا کسی معاملہ میں میرا دل میرے لئے تکلیف دہ  
ہوگا۔ تو اسے پہلے ہی سے بھانپ کر کسی نہ کسی طرح اس کا سد باب کر دینا اور اس طرح  
کرنا کہ مجھے اس کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

میں اور میرے دوستوں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ پاؤں ہلانا نہ ہو۔ اور ایوب صاحب کام کر  
دیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی تھیں جن کی تمام تفرہ داری مہیں پر ہوتی تھی۔ لیکن اس  
سے بذات خود عمدہ برآ ہونے کے بجائے یا اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو تو ہم سب ایوب  
صاحب ہی پر بھڑکتے تھے۔ اور ہانے نکال نکال کر انہیں سخت مسرت کہتے تھے ایوب  
صاحب معمولی بیگنی شروانی پہنے۔ ٹوٹا چھوٹا ہوتا۔ میلا سا مغلہ کچھ میں لپیٹے جلدی جلدی آ رہے  
ہیں۔ ہاتھ ان کا وہ چھوٹا سا قدر مشکل سے پانچ فٹ کا مشغول و منہمک مغلہ جلد جلد  
کھولتے لپیٹتے راستہ میں ہر ایک سے کچھ کہتے کچھ سنتے۔ گرتے پڑتے پہلے آ رہے ہیں۔ ابھی

فاصلہ ہی پر ہیں کہ جس شخص کے پاس آ رہے ہیں اس نے صلواتیں سنائی شروع کر دیں۔ آپ بچے کو سخت سست کی بوچھاڑ، ایوب صاحب ہیں کہ نام ہیں۔ بھگتے جا رہے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں۔ دو چار صلواتیں خود بھی سنا دیں۔ غرض دو چار منٹ کے بعد اطمینان ہوا تو ٹھکانے کی باتیں ہونے لگیں۔ وعدہ کیا کہ کام کر دیں گے نہ کریں تو جو جا رہے کر ڈالتے۔ چلتے نکلے تو پھر کام کی تاکید کی گئی۔ پان سات صلواتیں سنا دی گئیں اور اتنی ہی سن لی گئیں۔

ایوب صاحب کا گھر بار یعنی تھوڑا کلاس کا مسافر خانہ بنا رہتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ ٹھہرے ہوتے ہیں۔ بالخصوص امرا اور دوستوں کے لڑکے مجھے یقین ہے اور میں بلا خوف و تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایوب صاحب کے گھر میں قیام کر کے ان کے خرچ سے ان کی توجہ و محنت سے اور ان کے بل پر امرا اور ارجباب کے جتنے لڑکوں نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔ اتنا اب تک کسی اور شخص سے نہ اب تک ہوتا اور نہ شاید آئندہ ہو۔

ان کے گھر میں طالب علموں کا وہ ہجوم کہ اندر جا کر دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر شخص کو کھانا پلانا سامان دینا۔ ان کی ضرورتوں کو نظر میں رکھنا اور ان کی فکر کرنا۔ اس کے بعد آفس کا کام۔ دوستوں کا کام۔ غرض اس شخص کی شغوریتیں دیکھ کر ہر دم سب تعجب کیا کرتے تھے کہ یہ شخص زندہ کیسے رہتا ہے اور اس کے حواس کیوں نہ بکریں۔

اس کا اندازہ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ ایوب صاحب نے شاید ہی کبھی اپنے گھر کھانا کھایا ہو۔ یاد دوزر مسلسل اپنے گھر سوتے ہوں جہل مل گیا وہیں کھالیا اور دوسرا تو میں رات بھر کے لئے پڑھ رہے۔ چار پاتی بستر میسر آتے یا نہ آتے۔ آرام کر سی پر سو رہے۔ میز پر لپیٹ گئے ورنہ کچھ لپیٹ کر فرش پر ہی ایک طرف سکر سکر کر رات بسر کر دی۔ مشکل سے ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا سالن کھاتے تھے۔ اتنا کم کھانے والا بھی شاید ہی کہیں ملے۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیالی چائے

پہری اکتفا کر لیتے تھے۔

سنگٹ اور سحہ کے زیادہ شائق تھے۔ بیڑی سیگٹ۔ سنگار سحہ جو مل جاتے ان کے لئے کھانا کرتا تھا۔ دوستوں میں سے کوئی بیمار پڑا اور یہ آمو جو ہوئے۔ رات دن کا مسلسل تیم۔ باؤں و بارہے ہیں۔ دولا رہے ہیں۔ کھانا بنایا کر رہے ہیں۔ اور بغول ہم پورب والوں کے اس کا کوئی کمرہ ہے ہیں۔ بیماری میں آدمی پر چڑھا ہو جاتا ہے جتنا پڑاس کی ہر قسم کی زیادتیاں بھی سہہ رہے ہیں۔ بیمار اچھا ہوا تو شکریہ میں بھی سخت شست ہی کلمات کہے۔ ایوب صاحب ہیں کہ خوش ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ایوب صاحب کو جو لوگ صلواتیں سناتے تھے وہ سب ایوب صاحب کے گرویدہ احسان ہو کر یہ شعر اور بے فکر دل نے لطف و تشکر کے جتنے الفاظ وضع کئے ہیں وہ سب ان ٹالیوں کے سامنے بیچ تھے جو ہم سب ایوب کو دیتے تھے اور ان سے سنتے تھے۔ ایک دفعہ میری اور نیچے مکان گئے، میں اور دو بچیاں رہ گئیں۔ باورچی ایک بیک ملا گیا برسات کا موسم تھا۔ میں دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھر اٹھا۔ کوئی ۵-۶ بجے شام گھر واپس ہوا۔ دیکھا تو ہر چیز قرینہ سے مکان میں لگی ہوئی ہے۔ بچیاں صحن میں آم کھا رہی ہیں۔ ذرا ہی دیر میں ایوب صاحب آنکھ ملتے۔ لاکھ میں لت پت باورچی منانے سے ڈانٹ کر بولے جی پھرے اٹھاتے لکڑیاں لٹکی ہوئی ہیں۔ چولہا لٹکا ہوا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا کچھ سخت و شست الفاظ کے بعد آخر ڈانٹنگ ہال کو کیا ہوا تھا۔ وہیں سے انتقام کر لیا ہوتا۔ بولے۔ جی شام کے ۵-۶ بجے آپ کے لئے ڈانٹنگ ہال سے باقر نائیاں نہ جھانیں۔ بچیاں کیا کریں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کہ آفس سے براہ راست شہر گئے وہاں سے بچیوں کے لئے آم اور پکانے کے لئے کچھ ساگ نکاری لائے۔ بچیوں کو آم میں پھنسا کر خود باورچی خانہ میں پل پڑے۔ ترکاری ساگ اور کچھ اسی قسم کی چیزوں سے الجھے ہوتے تھے میں نے کہا۔ جی ایوب خدا کے لئے کچھ تو پھر کھانے کی

چیز کھا پی لیا کرو۔ ورنہ انھیں بھیک مانگنے لگیں گی۔ بولے سنا ب نے بھی تو تلخ ہی کھا کھا کر عید تک کے غم بڑھاتے ہیں!

کھانا پدینا ہو چکا تو آسم نکالے۔ میرے سامنے تولی اور لنگڑے رکھے اور خود چوسنے والے ام لے۔ میں نے کہا یہ کیا۔ یہ ام کیوں نہیں لیتے۔ کہنے لگے یہ آپ ہی کو مبارک ہیں۔ مجھے تو چوسنے والے ہی پسند ہیں۔ میں نے کہا چوسنے والے اپنے گھر کھا بیٹے گا۔ میرے ہاں اس قسم کی قومی حرکت کرو گے تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ کھانا پدینا ختم ہوا تو اپنی کھتری چار پاتی بھجیوں کی چار پاتی کے درمیان بچھا کر لیٹ رہے۔ اور ان سے انہیں کے دل سپی کی ادھر ادھر کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ جب وہ گتتیں تو سر سے پاؤں تک کبل تان کر خا موش ہو گئے۔ میں نے دیکھا تو کہا ایوب تم اس گھر سے نکلو۔ اس مڑی گرمی میں کبل اوڑھ کر بگدہ میں سوو گے تو ظاہر ہے تمام رات یہاں صحن کے اس چھوٹے پر رقص کر دل لگا۔ کیا فائدہ صبح میں پاگل خانہ پہنچا یا سب اکل اور تم قبرستان نہ مانے اور اسی طرح سووے۔ ان کا یہی معمول تھا۔

صبح جیتے جاگتے اٹھ بیٹھے اور دن کے دھندلے میں لگ گئے۔ علی گڑھ میں داخلہ کا زمانہ بڑے مہنگا مے کا ہوتا ہے۔ سارے بزرگان قوم جو سال بھر ہم سب کو گالی اور خباثت کو پیام بھیجتے رہتے ہیں۔ نئے سیشن کے شروع ہونے ہی ہم کو قرون اولیٰ کا مسلمان قرار دے جیتے ہیں پہلے خطوط آنے شروع ہوں گے۔ اس کے بعد تار اس کے بعد تلخے۔ منہ لادہ فریاد ایک ہی ہوتی ہے۔ یعنی لڑکا آپ کا ہے۔ یونیورسٹی قوم کی ہے۔ اور حکومت مہندوؤں کی۔ لڑکے کو داخل کرا بیٹے۔ جتنی مراعات ہو سکیں دلوائیے۔ بقیہ خود پوری کیجئے۔ پال چلن اور نرماندگی کی نذرانی کیجئے۔ پاس کر لیٹے۔ لڑکری دلوائیے اور ہم دونوں کو اس وقت تک نمان رکھتے۔ جب تک کہ لڑکا میاں کے ماحول سے آشنا اور خوداں سے متنفر نہ ہو جائے۔ حج اور تبرقہ

کے بارہ میں تو یہ طریقہ ہے کہ ملک کے مختلف علاقے مطوف اور پٹنوں نے بانٹ لئے ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں یہ آپ کی جان و مال کے ذمہ دار اخلاقی فوجدار ہیں۔ جان کے کم۔ مال کے زیادہ۔ علی گڑھ کا دستور اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس کا جی چاہے جس جس مطوف پانڈے کے ہاں ٹھہر جائے۔ اور اس کی جان و مال کا انچارج بن جائے۔ واسطہ کار زمانہ عین برسات کا ہونا ہے۔ ظاہر ہے برسات ہمانداری۔ اور قوم کی مرثیہ خوانی کا بیک وقت زور ہو۔ اور کام کوئی نہ ہو تو وعدہ کب تک ساتھ دے گا۔ والدین میں سے کوئی بچپن میں مبتلا ہے۔ کوئی اسماعیل میں کسی کو یونانی علاج موافق نہیں آتا۔ کسی کو ڈاکٹری دوا سے اصولاً اختلاف ہے۔ کھانا ناشتہ سب کو موافق حکیم صاحب کے ہاں لے جاتے یا انہیں بلاتے تو بتاتے گئے۔ موجودہ شکایت اور علاج کراتیں گی دیرینہ شکایات کا!

یہ افغانی معمول میں نہیں استعمال ہوا ہے یہ علی گڑھ میں ترک موالات کے زمانہ کی یاد دلا رہے۔ جب ہر لڑکے کا کوئی نہ کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو سمجھنے سمجھنے علی گڑھ آیا تھا۔ اس زمانہ میں طرح طرح کے بزرگوں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ لوگ گھبرا گئے تھے۔ چنانچہ اب جس لڑکے کے ساتھ کسی غیر معمولی ایسکی چالیس سال سے دائرہ کے بزرگ کو کوئی دیکھ لیتا ہے۔ فوراً کہہ پڑتا ہے۔ "فہو الوالدین" بیان تک کہ اگر کسی لڑکے کے ساتھ گھر کا کوئی پرانا تو کر بھی آئے تو لوگ کہیں گے فلاں صاحب کے ساتھ ایک لڑکین بھی ہے۔ ایک والدین کا فقرہ علی گڑھ میں قطعاً سوز و دل سمجھا جاتا ہے مثلاً میں نلال جگہ جا رہا تھا راستہ میں ایک والدین ملے۔ چنانچہ علی گڑھ کی لغت میں والدین کے معنی خواہ مخواہ ماں باپ کے نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی بزرگ نا صورت کا اجنبی جو کسی طبیب علم سے وابستہ نظر آجائے۔ والدین ہے۔

اس زمانہ میں اور ایسے مواقع پر ایوب مرحوم کا آتے تھے۔ کسی کے لئے چار پائی کی ضرورت تھی۔ تو وہ لا رہے ہیں۔ کسی کے پاس سائیکلیٹ نہیں ہے۔ اس کی سبیل نکال رہے ہیں۔ کسی کو مخصوص بورڈنگ ہاؤس میں جگہ نہیں مل رہی ہے تو اس کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس روپے نہیں ہیں۔ تو ادائیگی بالافراط کی کوشش کر رہے ہیں۔ کسی کے پاس کتاب یا فرنیچر نہیں ہے تو اس کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کوئی اسپرچی مال کے عیشتستان میں کھو گیا ہے تو اسے راستہ پر لگا رہے ہیں والدین یا سرپرستوں نے لئے حقہ یا پرائے اُوندو لالوں کی ضرورت ہے۔ تو اسے فراہم کر رہے ہیں۔

اور سب کچھ ہو گیا تو اشارہ کیا یہ سے حیلہ حوالہ سے۔ خوشامد کر کے روپیٹ کو بھجوا کر آمادہ قتل یا خودکشی ہو کر ہومان کو میزبان کا گھر چھوڑنے اور اپنے اپنے گھرانے پہنچنے کا مرحلہ طے کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ نہیں ہو رہا ہے۔ میرے گھر آپ کے گھر۔ دوستوں کے گھر اور خدا جانے اور کہاں کہاں یہی قداما ہو رہا ہے۔ ایوب صاحب میں کہ اپنے فرائض اور اپنی مصیبتوں کو نظر انداز کر کے دوستوں اور دوسروں کی مصیبت میں شریک ہیں۔ میزبان ہمنوں سے تو کچھ بولتا نہیں لیکن آخر غم غصہ نہ لانے کا کوئی موقع تو ہو۔ اس کے لئے ایوب صاحب تھے۔ انہیں بلایا گیا۔ یہ پہنچے تو کچھ متروہ ہوتے۔ کچھ نام اور کبھی کبھی نالی بجا کر قہقہہ لٹانے لگے۔ پھر بے معلوم ہوتا ہے کوئی اور آیا یا کسی اور کو دست آئے۔ رشید صاحب والدہ خوب ہوتا بڑا مزہ آ رہا ہے اور لکھنے مزا جیتے معنون۔

ایوب مرحوم کو بری کھیلنے کا جراثیق تھا۔ ان کی زندگی میں اور کچھ انہیں کی وجہ سے ہم لوگ بھی اس کے بڑے شائق ہو گئے تھے بازی نہیں دگائی جاتی تھی۔ اس لئے کہ ہم میں ایک سے ایک ناٹری کھیلنے والا تھا جتنا کھیلتے تھے۔ اتنا ہی تنزل کرتے تھے۔ پھر ایک دوسرے کو خواہ وہ عییتے یا ہارے سخت حسرت اُٹاتا کہہ لیتے تھے کہ کسی اور بدل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس نادمہ میں بھری کا لفظ اخبارات میں آیا تھا۔ بے تکلف عیبتوں میں ایوب مرحوم کا یہی نام رکھ دیا گیا تھا۔ مرحوم

بھی کچھ کم نہ تھے ہم سب کو بھی وہ ایسے ایسے ناموں سے پکارتے تھے کہ ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ ان کے بغیر تاش کی صحبتیں بالکل بے کیف ہوتی تھیں۔ بدھن و فدیہ پڑھنے کے ایوب مرحوم کھیل میں موجود نہ ہوتے۔ ننھوڑی ہی دیر میں سب نے تاش چھینک دتے۔ کہ بغیر سیریں کے کوئی لطف نہیں۔ رات کافی گزر چکی ہے۔ ڈاکٹر عباد الرحمن خلی کی موٹر پر ہم سب ان کی تلاش میں نکلے۔ بڑی دودھ چوپ کے بعد کسی دوست کے ہاں ملے اپنے گھر چونکہ جتنے ہی نہ تھے۔ اس لئے وہاں ہم سب کبھی نہ گئے۔ دوست کے ہاں بھی رونق محفل وہی تھی۔ اس لئے وہ لوگ بھی مارنے مرنے پر تیار نہ ہوتے کہ ایوب کو جانے نہ دیں گے۔ بڑی بڑی خوشامدوں سے بالکل جھگڑ کر انہیں لاتے اور محفل پھر سے جاری۔ تاش کے شائق اتنے غصے میں براہ راست کبھی نہیں کہتے تھے کہ چلتے تاش کھیلنا جاتے آتے اور ٹھیکے گئے۔ اور صراحت کی باتیں شروع کیں۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ اس لئے عمدائیں متعلق باتیں چھینتا رہا۔ یہ برابر وار خالی دیتے رہے۔ آخر کار میں نے کہا۔ ایوب صاحب تم کو تو تاش کا ہیغہ ہے۔ نہایت بخیدگی سے بولے جی ہاں۔ آپ لوگوں کو تو شاید چھینک بھی نہیں آتی۔

ایک دن میں اور ایوب مرحوم بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نہایت دیندار و اہل بی بزرگ آئے شکل سے کچھ قوی کچھ علمی اور ننھوڑے بہت سنا یافتہ معلوم ہوتے تھے اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے حرف مطلب زبان پر لائے یہ بھی سوچا تو اور باتیں شروع کریں۔ ایوب صاحب پر عجب پڑا تھا۔ بار بار سگریٹ پیش کرتے اور سر ہلاتے جاتے تھے۔ بزرگ رخصت ہونے لگے تو بڑے رشید صاحب آپ جیسا مزہ میرے نمون کھنڈا لاکتی ہو نہیں! ایوب صاحب اٹھ کر میں بھاگے جب اہل بی بزرگ جا چکے تو یہ بڑا ہنس مچھٹے مچھٹے لڑے جاتے تھے اور بار بار کہتے تھے اور نکھتے مزہ میرے نمون!!



میں تیار ہوا۔ دونوں ڈاکٹر اصرار کے ہاں پہنچے۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ وہاں کیا پیش آئے گا۔  
ایوب مرحوم کو دیکھتے ہی دلگارا۔ ہر محسن دروازہ کے اندر قدم نہ رکھنا۔ مرحوم بولے بس بس جناب  
ڈاکٹر صاحب بہت زور نہ باندھتے۔ دروازہ کے اندر سے خود تو کبھی قدم نہ گانے کی بہت نہیں  
ہوتی اور نہ بھکی یہ دیکھتے (انتھے میں ڈاکٹر عباد الرحمن خاں بھی آگئے تھے)۔ معززین شہر شریف لاکے  
ہیں۔ اصغر صاحب بولے لعنت ہے معززین شہر پر اور آپ پر اسی سانس میں لوگو کو آواز دی۔ میز  
بچھاؤ پاندان لے چلو۔ ایوب مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے۔ کیوں جی باورچی تلاش کیا مرحوم بولے  
بھیجا تو تھا۔ آپ کو ملا نہیں؟ بولے لعنت ہے۔ باورچی بھیجا تو آیا بھٹی۔ اپنی ہی شکل کا ڈھونڈتے  
ہو۔ مرحوم نے نہایت تنبیہ ہو کر جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب کیا کروں۔ آپ کی شکل والا تو یونیورسٹی  
والے نہیں چھوڑتے کیا کیا جائے۔

ایوب صاحب کی سیرت و شخصیت کا عجیب اور نادار پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا آدمی ہو یا  
چھوٹے سے چھوٹا ان سے عزت آمیز محبت کرتا تھا۔ ترس کھا کر یا مجبور ہو کر نہیں بلکہ ان سے  
محبت کرنے میں اُسے لطف آتا تھا۔ ایوب سے محبت کر کے جیسے دل کو تسکین ہو جاتی تھی۔ ایک  
طرح کی پرافتخار اور اطمینان بخش تسکین جیسے یہ احساس کہ ہم ہیں بھلائی کرنے والے بلند ہونے کا جذبہ یا استقلال  
ہے۔ محبت کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے۔ جو اپنے سے حقیر یا پست حال سے کی جاتی ہے۔ جیسے لوگ  
اپنے گھٹے سے کرنے ہیں یعنی اُسے سمجھتے گناہی ہیں۔ لیکن چرتے چکا رنے رہتے ہیں۔ اس قسم کی محبت  
با احوال بڑے آدمی چھوٹے سے کرتے ہیں۔ لیکن تحت شعوری ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ محبت یا اخلاق کا  
مخافہ کرنے کے اعتبار سے تو لوگ انہیں انسان سمجھیں۔ لیکن خود ان کے جذبہ فرعونیت کی تسکین  
ہو۔ یعنی ہم ایسے ہیں کہ ترس کھا کر اپنے بندے سے محبت کرتے ہیں اور اس طرح طوطہ پر اس کی زندگی  
میں امید فخر کی ہلکی سی لہر دوڑا کر رسم چٹنوں میں بیٹھنے اور سر بلند ہونے کے قابل بنا دیتے ہیں اس طرح

کی محبت یا عزت، ایوب صاحب سے کرنے کی کسی کی بہت نہ ہوتی تھی۔ ایوب صاحب وہ تھے جس کے لئے ہر شخص اپنی عزت یا شہرت کو داؤ پر لگا دینے کے لئے بے تامل تیار ہو سکتا تھا۔

ایوب سے محبت نہ کیجئے یا ان کی عزت نہ کیجئے تو یہ محسوس ہوتا کہ ہم میں شریفی، بھینٹ یا ذمہ داری کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیر نظر رکھتے کہ ایوب صاحب کے دل میں یہ بات کبھی گزری ہی نہیں کہ ان کی خدمات کا صلہ مل رہا ہے یا نہیں۔ معاوضہ کا احساس شاید ان میں پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بڑے چھوٹے کی خدمت یکساں لطف و ناز دہی سے کرتے تھے۔ ہر دوست کے دفتر میں سب سے اہم عہدہ پر ہونے کے سبب سے ان کا سابقہ طلباء، اساتذہ، بڑا، باورچی، نانی، چچا، بھتیجی، بھتیجی سبھی سے براہ راست پڑتا تھا۔ طلباء کو خوش اور مطمئن رکھنا معمولی بات نہیں ہے۔ ان کا ایوب صاحب سے طرح طرح سے سابقہ پڑتا تھا۔ وہ ہر طالب علم کے خاندانی حالات و معاملات سے واقف رہتے تھے۔ اور اسی اعتبار سے ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس لئے ہر طالب علم ان کو اپنے گھر کے بزرگ اور خیر اندیش کی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ یہ نیوٹرٹی میں سٹرنک ہے۔ لڑکے ہیں کہ بے تامل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ایوب صاحب کا ہمدردی پر کام کر رہا ہے۔ ایسے زمانہ میں ان کا طریقہ عمل بالکل سے وہی ہونا جو میدان جنگ میں صلیب احمر کا ہوتا ہے۔

اوتنے درجہ کے ملازمین سے ان کا سلوک مسکرات و ہمدردی کا ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ ایوب کو اپنا افسر نہیں بلکہ رفیق سمجھتے تھے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ ہشتیوں کی کانفرنس کی دعوت کر رہے ہیں۔ اور جیسا کہ ایسی کانفرنسوں میں ہوتا ہے ہر بستی آپے سے باہر تھا۔ ایوب صاحب جلدی جلدی سرگرم پڑتے اور بار بار باہر جا رہا ہوتا کہ تے جاتے تھے۔ ہر ایک سے مخاطب ہوتے تھے۔ کبھی خود جام سے باہر ہو جاتے اور کبھی نہایت متانت سے سمجھانے لگتے۔ میں اُدھر سے نکلا تو کچھ سٹاٹسٹ اور شرماتے۔ میں نے کہا واللہ ایوب آج تو بچا بنا دشوار ہو گیا۔

جا کر مولینا سے کہوں گا۔ کہ نوح کا پس پردوں میں بیٹھے بیٹھے ہشتیتوں میں بیٹھے لگا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر بڑے زور سے مٹھے کہنے لگے ہاتھ ہڑتا ہوں۔ ذرا بیٹھ جاتیے حالانکہ بڑا آگے گا۔ میں نے کہا جی نہیں آپ کو کیا آج یہ بے کل بھنگیوں کی کانفرنس کی صدارت کرنے لگیں گے۔ فرمایا ہر جی کیا پانی اور فنائل کا انتظام تو کہیں گیا نہیں۔

مرض میں چلا آیا۔ ایوب صاحب بھی صدارت سے فارغ ہو کر تاش کھیلنے کے وقت پہنچ گئے۔ ایوب صاحب یونیورسٹی کے معاملات یا انجمنوں سے عہدہ علحدہ رہتے اور سنی القدر اپنے دوستوں کو بھی علحدہ رکھنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے مسائل پر انہوں نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی کبھی فرصت جتنی اور یقین جتنا کہ میں گھر آؤں گا۔ نہیں تو وہ اپنے خاندانی فقیہوں کا تذکرہ چھیڑتے اور جو کچھ دل میں ہوتا بیان کر دیتے۔ میں ان کی انجمنوں کو ہمدردی اور توجہ سے شغفنا تو ایسا محسوس کرتے جیسے ان کا جی ہلکا ہو گیا۔ اور ان کے دھکے درد کا مداوا ہو گیا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے کچھ بہت زیادہ راضی نہ تھے سب کے سب ایوب صاحب کی شرافت اور کشادہ دلی سے تاباں تر نازاں اٹھانے کے درپے رہتے تھے۔ اس کا انہیں غم تھا اور غم غلط ہی کرنے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے مایک دن بہت اداس تھے۔ آئے تو میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح ان کا جی بدل جاتے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ یک ریکٹ بدیو ہو گئے۔ میں نے پوچھا تو بڑے قائل کے بعد واقعہ سنایا۔ وہی عزیزیوں کی دیانت اور شجاعت کا۔ میں نے کہا۔ ایوب صاحب آپ بد دل نہ ہوں۔ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ غرض محل اور نیک نام کیوں نہیں۔ بریخیال ہے کہ بیشتر حوصلہ منافی امور کے دلوں سے نیکی اور فیاضی اٹھالی گئی ہے۔ خیال رکھو تو یہ مسرور اور با فراغت دیکھ کر غرض ہوں گے اور

علحدہ مولانا ابوبکر محمد شہید، فاروقی صاحب قبلہ، ناظم دینیات سلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایوب صاحب کے عزیز  
شریف۔

فخر کریں گے لیکن اپنیوں کو دکھانا پدینا ہنستا بولنا دیکھ کر تخم و غصہ کے انگاروں پر لوٹنے لگیں گے۔ یہ اپنے بچے بن اور بے غیرتی کو اپنی بہت بڑی خوبی اور اپنا بہت بڑا حربہ سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے کھاتے کھاتے عزیز کو غاصب سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان تمام نعمتوں پر قبضہ نہ کیا تھا نہ کر رکھا ہے۔ جو بصورت دیگر ان کے قبضہ میں آتیں۔ وہ بھی نہ دیکھیں گے کہ وہ خود کتنے ناکارہ اور بے ایمان ہیں اور جو فراغت ناموری اور نیکنامی سے رہ رہا ہے۔ اس نے کتنی محنت کی ہے۔ اور لذتِ الطافی دہتے۔ میں نے تو آج تک اپنے کسی عزیز کو ایسا نہ دیکھا۔ جس میں محنت اور ایمان داری کی استعداد دہوتی۔ اور وہ اپنے کسی عزیز کی فراغت و مرست پر کڑھتا۔ کڑھتے میں نے انہیں کو پایا جو غایتِ درجہ کے نکتے اور بے ایمان ہوتے ہیں برا

اور یہ کچھ ہمارے بیشتر رشتہ داروں ہی کا حال نہیں ہے۔ بلکہ اس انفرادی کمزوری اور کمزوری نے پھیل کر جماعتی رنگ اختیار کر لیا ہے۔ جماعتی ہی نہیں بلکہ قومی اور سیاسی بھی سرمایہ و مزدور کی جنگ اپنی جگہ پر مبنی جو مناسب ہے اور جہاں تک اس کے اخلاقی و اقتصادی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ اس کے معقول ہونے میں شبہ بھی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سکیم کو چلانے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے درپے بیشتر وہی لوگ ہیں جو نکتے، برتن و غلط اور کینہ پرور ہیں۔ دنیا کے کسی آشوب کا عالم کچھ آپ کو بالآخر ہی نظر آئے گا۔ کہ معقول نظام یا تحریک نامعقولوں کے ہاتھ میں پھٹی۔ آپ ہی سوچتے کیا مزدور اور کارگر کے علاوہ کوئی اور طبقہ اس دنیا میں قابلِ موت و لحاظ نہیں ہے۔ اور کیا مزدور کارگر ہی سے وابستہ ہے؟ دنیا کی نجات دولت کی مسدوی تقسیم پر نہیں ہے۔ بلکہ محنت اور قابلیت کو صحیح احساس و تنظیم پر ہے۔ میں آج کل بازگیروں کے اصولی تقسیم کا قائل نہیں جس سے دولت ان کے ہاتھ میں جائے اور مساوی "میرے ہاتھ میں آئے!"

آخر میں میں نے ان سے کہا۔ ایوب صاحب اپنا کام کتے جاہلیتہ۔ دولت و ثروت کا صاحب

و مطمئن ضرور ہوتا ہوں۔ لیکن جب رفیق اور اُترب یاد آتے ہیں تو دل بے اختیار ہمو کرنا ممکنات کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یعنی کاش دونوں زندہ ہو جاتے اور میں انہیں اسی مکان میں گلے لگاتا۔ ان کا خوش ہونا اور دھوم مچانا دیکھنا اور مٹن ہوسنا تاکہ میں نے بھی کچھ کام کیا۔

سروی کا زور اور دوسروں کا مجمع تھا۔ ہم سب ڈاکٹر عبدالرحمن خاں کے ہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ اُترب مروت نے کہا۔ سروی لگ رہی ہے۔ کسی نے تو بڑبڑائی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لیکن کسی قدر سقاہ ہو کر کہا۔ بڑی سروی ہے۔ رشید صاحب میں چلا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ نہ ٹھکانے سے دہکتے ہو سروی کیوں نہ لگے۔ یہ کہہ کر اندر سے اپنا دفنی گرم ام کوٹ لاتے اور مروت کو کچھ طرح اڑھا دیا۔ چلتے منگائی اور پلائی۔ اس کے بعد ہی مروت نے کہا رشید صاحب میں چلا میں ان کے لہجہ سے اور ان کے چہرہ کی طرف دیکھ کر چونکا۔ کھیل ختم کر دیا گیا اور ہم سب انہیں اڑھا ڈھکا کر ان کے مکان پر پہنچا آتے۔ صبح سے بخار نے زور پکڑا۔ لاکھ لاکھ جتن کئے گئے۔ لیکن بخار اور کجوری بڑھتی ہی گئی۔ دوسروں کی تشویش بڑھی۔ بابوسی بڑھی اور مرض الموت بڑھا۔ دو تین ہفتہ کے اندر سب کچھ ہو گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ مرض کیا تھا۔ سب نے یہی فیصلہ کیا کہ وقت آ پہنچا۔

شام کے قریب نزع کے عالم میں تھے۔ مکان کے باہر نیمیورسٹی کے طلباء اور علما دین کا مجمع تھا۔ لیکن ان سے قریب اور انہیں میں ملا بلا ایک اور ہجوم تھا۔ بھنگی، بھشتی، چہرہ اسی۔ ناقتی۔ دھو بی۔ بیرے۔ باورچی۔ خانا سما۔ خاناچہ والے اور ان میں سے بہنوں کے بیوی بچے خاموش۔ مایوس سر جھکاتے، افسردہ ہجوم تھا جو کسی مرنے والے کے دروازہ چیب کہ وہ اس جہان سے گزرنے والا ہی ہو۔ میں نے گزشتہ پچیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔

مروت کو سپردِ خاک کیا گیا۔ موبینا ابوبکر صاحب نے قبر کے سر ہانے کھڑے ہو کر فرمایا۔ اے بھائیو! اُترب اپنے پیدا کرنے والے کے ہاں پہنچ گئے اگر ان سے تم کو کوئی نیکبخت پہنچے ہو

تو معاف کر دینا۔

گر یہ سب کے گلو گئے تھے۔ کسی نے روکا اور کسی سے نہ رکا!  
ایک غم نصیب کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور دردناک صدا بلند ہوئی۔  
”کیا یہاں کوئی اب بھی موجود ہے جس پر اللہ کی خدمات کا صلہ واجب الادا نہ ہو۔ اس  
آواز کو سنا کسی نے نہیں محسوس سب نے کیا!

---



# سُر اقبال مرحوم ۔

جس سے جب گمراہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم  
دریاؤں کے دل جس سے دہاں جاتیں وہ طوفان  
بڑی گرمی پڑ رہی تھی۔ دلوں دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا۔ علی گڑھ اسٹیشن کے پلیٹ فارم  
پر اتنا ہی تھا۔ کہ ایک عویز نے کہا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ غصوڑی دیر کے لئے، بہت تھوڑی  
دیر کے لئے کچھ ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے۔ لیکن اس کی نہ کوئی آواز  
ہے۔ اور نہ اس میں کوئی حرکت۔ یہ بات صرف ایک آن کے لئے تھی، کائنات کا پھیلانے،  
پینے اور پیداکرنے والا، پرہیزگیت و پڑاسرار گراں پسیدہ ہستیہ جو آن کی آن رک کر اٹھ چلنے والا  
معلوم ہوتا تھا، اپنے مقررہ رُخ و رفتار پر لوٹ گیا۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ پھر



رواں دواں نظر نہ لئی برکان واپس آیا۔ نہ نہانا اچھا معلوم ہوتا نہ کھانے کو جی ہوا، جیسے نفس اپنے مطالبات بھپور بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے کرو بند کر کے لیٹ رہا۔

جن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹ شروع کر دئے۔ طفولیت کا زمانہ یاد آیا۔ جب اقبال کے اشعار پھیننے کی دوستی کی طرح منہ دار اور جال شاہ معلوم ہوتے تھے اور خود اقبال کا یہ تصور تھا کہ وہ ہر اشعار کہتے ہیں انہیں میں رہتے بستے ہیں۔ اقبال کی صورت وہی ہوگی۔ جو میرے اپنے قصوات کے عمل سے پیدا ہوتی تھی۔ بہت اچھی سی، بہت چاہی جانے والی جیسی جادو گروں جیسی، کچھ عجیب سی۔

یہ بات بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے کہ اب بھی جب کہ ادراک و شعور ایک گونہ مکمل ہو چکا ہے۔ اچھے اشعار کا مجھ پر وہی اثر ہوتا ہے جو بچپن میں ہوتا تھا۔ معنی و مطلب کے نتیقین ہونے کے بعد ہی تھوڑی دیر کے لئے معلوم نہیں کیا چیز و قصوات کو معلوم نہیں کہاں کہاں لئے پھرتے ہیں۔ وہی افسانہ و افسوں، وہی روشنی و تاریکی، لذت و اذیت، خوف و امید جو بچپن میں پیدا ہوتے تھے اب بھی بیدار ہو جاتے ہیں، جہاں پہرتے ہیں لئے پھرتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں بھوڑ دیتے ہیں۔

۱۹۲۵ء میں میں مرموس سے ملنے لاہور گیا تھا۔ اقبال کے کلام میں جو باتیں بچپن کے تجسس میں دل چسپ معلوم ہوتی تھیں۔ اب تجزیہ و تجربہ کی زد میں ناقابل فہم معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں صرف پڑھنے اور اپنے طور پر لطف لینے کی منزل سے گزر چکا تھا۔ اب پڑھانے کو بڑے نگر و پر لطف بنانے کا فرض عاید ہوتا تھا۔ شعر میں شاعر غالب نظر آتا تھا اور ہر دل آویزی تاثرات پر رہی نہیں۔ بلکہ فکر و تجربہ کی صحت و صداقت پر محض معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں میں نے محسوس کیا کہ خود شاعر کو دیکھا جاتے۔ اس کے اشعار ہی سے نہیں بلکہ اس کی شخصیت سے بھی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جاتے شاعر اپنی ترنگ میں جو چاہتا رہے۔ کر دکھاتا ہے۔ یہ تو نسبتاً آسان ہے

جیہنا یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی ترنگ یا مذہب سے کس طرح عمدہ برسا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی بدبات کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ یا دوسروں کی تشفی بھی کر سکتا ہے۔

غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے، میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ عنقہ (بو) باندھنے کا رد و دست کرتے ہوئے برآمد تھے۔ اٹھا ہوا جسم، چوڑی چکی ہڈیاں مروانہ انداز، آنکھوں کی ساخت اور مچھوں کی وضع کسی تھکرا نیوں بیسی، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مسکڑنے میں آنکھوں کے گوشوں میں بھر پل پڑتی تھیں۔ جی سے دکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا۔ بڑی خوش ولی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں لئے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں بولے، آپ ہیں جی، صدیقی صاحب! میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور ان کا علیہ دیکھ کر تجیر اور مرحوم کے اندازِ مخاطبہ اور لہجہ سے کسی قدر دل گرفتہ ہوا۔ اسنے میں نوکر کو آواز دی اور پچابی میں تسلیم ہانے کو کہا۔ ظلم کا لفظ سن کر میں گھبرا اٹھا۔ علی گڑھ میں پچابی لفظ سے آشنا ہو چکا تھا۔ لیکن دہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات ہم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی صفویروں سے متعلق ہوں گے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بناتی ہوئی بہشت کو بلیں و دم برہم ہونے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہتے تھا۔ وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے بولے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ عنقہ ان کے لفظ میں کچھ ایسا معلوم اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابل بیان مروت و رحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں سخت ضرور فضا۔ گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی نفس فیض ہوتی جس کا حسین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا۔

تھوڑی دیر کے لئے کمروں میں بیٹھے۔ علی گڑھ کا سال دریافت فرماتے رہے۔ آواز بھاری تھی۔

لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور اور صفائی بھرتی جاتی۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور دالمانہ دونوں اہل ذہن متوازی و متوازن ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے۔ یہی بات مجھے ذاکر صاحب میں ملتی ہے۔ علامہ مرحوم کی باتیں سننے بلکہ طیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جاتیں تو فوراً محسوس ہوگا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقرات پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دوسرے سے ادب بڑی گہرائی سے آتی تھیں۔ ان کی گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجاتے خود مدنا تہ و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی تھیں۔ البتہ سبب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرہ پر رون کی سرخی جھلکنے لگتی تھی۔

اُسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے اُس وقت ایک نوجوان شاعر آگئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے، ان کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا۔ کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ نوجوان کی گفتگو میں لعلی زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ساسل خاموشی کسی قدر سبب زاری میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ محبت ختم ہو گئی، صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے۔ اندر سے دیر میں برآمد ہوئے۔ چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا۔ غفوری دیر تک حقہ کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے۔ اس کے بعد فرمایا، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آگئے۔ اب طبیعت بحال ہو گئی تھی مگر ایک سے پرسش حال کرتے رہے وہی اس طرح پرسش کر رہے تھے کہ رسم اچھا ہے یا برا۔ رسمی باتیں تو وہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مقصود دکھ سکھہ سناتے۔ لوگ مرحوم کے حلقہ میں متنفذین کی کیفیت سے ڈر رہے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے۔ بلکہ محبت اور تہ تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص

مروم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے مٹھنا اور خورد بھی بنے نکلفی سے اپنی مٹھنا۔

دوسرے دن پھر مروم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آج کہیں جانا نہ تھا اس لئے بڑے اطمینان اور  
 بے تکلفی سے باتیں شروع کیں۔ اس زمانہ میں اقبال کے نظریہ فرق البشر کا بڑا چرچا تھا۔ بعض باتیں  
 میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس لئے اس پر میں نے خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ مروم نے  
 بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انسانی خوش ولی اور خود اعتمادی کے ساتھ حیران کی سہیت کا بڑا ہی گلاب قلند  
 پہلو تھا۔ اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ مجھے اس وقت جو چیزیں عجیب اور خوش آئند معلوم ہوتی تھیں وہ  
 یہ تھی کہ مشکل مسئلہ کو مروم کس خوبی سے واضح کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا جیسے قنادیہ مسئلہ  
 میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں مخلصانہ نقطہ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نامعلوم  
 مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آ جاتا ہے۔ اسی صحبت میں محمد ذوق کا درجہ، ذوق البشر، بعثت  
 نبوی کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے۔

میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گزشتہ مضامین میں جہاں تھا لیا کیا ہے لیکن ایک بات بھی  
 کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا۔ وہ یہ ہے کہ مروم کو صرف شاعر سمجھ لینا یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات  
 تمام کے تمام ان کے کلام میں عقیدہ ہو چکے ہیں۔ بڑی غلطی ہے۔ مروم کی فکر و نظر کا بہت کم حصہ ان  
 کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور بھی نہیں بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا جیسے  
 بعض بالکل ہی نئی باتیں دوران گفتگو میں ان پر کسی کوشش کے بغیر نکشف ہو گئیں۔

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلہ پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے، مسودہ بھی تیار ہے  
 جو چکا تھا اس کا فیاضیہ تھا۔ فرمایا ان مسائل پر میں بعض مستند علماء سے تبادلہ خیالات کرنا  
 چاہتا ہوں، تمہارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سو مند ہو گا میں نے عرض  
 کیا کہ میں اس کو چیتے نہ ہوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر

علماء دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچیدہ ہیں کہ ہر تہذیب میں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کئے ہوتے ہوئے ہیں اس لئے ان پر ہر ایک علمائے کرام مناسب رستے قائم کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ جب تک ننڈا زعفریستہ کی ماہیت معلوم ہو۔ اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جاسکتا ہے۔ میر خیال ہے کہ آپ کے سامنے مسائل کی جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یفرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ یا کریں گے۔ اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارہ میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ٹاکر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے۔ اور جب تک مبینہ فی سائنس یا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے۔ ان خطوط میں رسمی تصانیف کو بالکل دخل نہ ہوتا۔ اور سرایت کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا۔ وہ مشکل مشکل اور نازک سے نازک مسئلہ میں بھی جلدی صاف گوتی سے کام لیتے۔ بڑے آدمیوں کی طرح ان میں یہ کمزوری نہ تھی۔ کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کٹر کے نکل جانے کا امکان باقی رہے۔ ان کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا۔ اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی ہنر مند اور معتدین ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے۔ وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے اس میں جذبات کو اتنا نہیں جھٹکا کہ فکرو مذہب کو دخل ہوتا۔ چنانچہ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا۔

ان کی شاعری کا انداز بھی پہلے ہی تھا۔ جس طرح مسائل کی توضیح میں تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تدبیر حکیم یا فلسفی کی بڑائی یا کامیابی کی دلیل ہے۔ ٹھیک اسی طور پر جذبات کا

۱ احتساب کرنا اور اس کو مناسب و موزوں اسباب میں طوالت شاعر کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اقبال کی شاعری خود شاعری کی معراج ہے۔ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دے دیا ہے اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا۔ دونوں صورتوں میں اقبال کا آرٹ اور الیقان دوش بدوش کا فرض ملتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا کلام پڑھ کر ہم کو محسوس نہیں ہوتا کہ اقبال کہاں اور کہاں تک حکیم اور کہاں اور کس حد تک شاعر ہیں۔ بلکہ محکم اور شاعر درالحدہ میں حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف۔ لیکن بالآخر وہ نثری (ایک دوسرے میں موزوں یا ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ اور یہی اقبال کا آرٹ ہے۔ اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال نے فطری ملکات کو لٹری ریا منقول اور مادراتی بصیرتوں سے ایک نئی حسین اور لازوال صورت یا نوعیت بخشی۔ شاعر کا طبعاً شاعر یا مفکر کا طبعاً ہونا میرے نزدیک کوئی بہت بڑی نعمت نہیں ہے۔ نعمت تو وہ توفیق ہے جو فطری استعداد کو لٹری نعمت بنائی ہے اور غالباً ہی توفیق وہ توفیق الہی ہے جو انسانیت کو نہ صرف انسانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے سے بچاتی رہتی ہے۔ بلکہ انسانوں ہی کے ہاتھ نہایت کو فوضِ عظیم پر فائز کرتی ہے۔

علی گڑھ میں ایک دن دو سنتوں کی ایک علمی صحبت میں حافظ کے مشہور شعر

حد باد و صبا، اینجا بے سلسلہ می رقصند

ایں است بر لیل لہ دل تا باد یہ می پیاف

پر گفتگو مہنے لگی۔ اپنے اپنے نقطہ نظر سے ہر ایک نے خوب خوب سوش گافیاں کیں۔ بالآخر بیٹے متروکہ ڈاکٹر اقبال سے رجوع کیا جاتے۔ چنانچہ مرحوم سے استعجاب راتے کیا گیا مرحوم نے فراموشی جواب لکھ بھیجا ہر راستے پر جا کر کیا۔ اور آخر میں لکھا کہ شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے مطالب کو ریاضیات کے اصول یا فطر رکھ کر پیش کرے اس لئے شعر کے

۷ مطالب جدا گانہ بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ منقذا نہ ہوں۔ آپ کے چل کر لکھا تھا کہ کبھی کبھی شاعر اپنی انداز کا پورے طور پر خود مستقصا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا چار نہیں کہ وہ واقعہ بیان کرنے کے بجائے ایسی فضا کی طرف رہبری کر دے جس میں اس واقعہ کے پیش آنے کا قوی امکان ہو۔ اور حال ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ لے آخر میں لکھا تھا کہ شاعر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو منطق سے نہیں بلکہ ان موزوں سے اپنالے جو اس کے شعر میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا کر رہے ہوں۔ شاعرانہ رموز نہ منطقیانہ رموز ہوتے ہیں نہ فلسفیانہ، وہ شاعرانہ ہی رموز ہوتے ہیں۔

سلسلہ میں میں بہت بیمار تھا۔ ڈاکٹر صاحب انیس دنوں یا وہ نہیں آتا کس سلسلہ میں علی گڑھ تشریف لاتے تھے۔ ایک دن صبح مکان تشریف لاتے۔ اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی۔ مشکل سے باہر آیا۔ میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رنگ رک کر کہا ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ باتے اُن کا وہ چورنگ کر لیکیں فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لمحوں میں فرمایا۔ نہیں جی صدیقی صاحب، کوئی بات نہیں۔ اللہ اپنا فضل کرے گا۔ اچھے ہو جاؤ گے، پھر لاہور آنا، مایوس کیوں مہرتے ہو، مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے۔ اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے۔

اس کے بعد ویر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں بیچھول گیا کہ بیمار بھی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں

جنتلارہ کر عالم بقا کو سدھارے۔ کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لئے وہ کر سکتا جو انہوں نے میرے لئے کیا تھا۔ پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا وہ خاصا ان بارگاہ سے تھے۔ اُن کا خدا سے خاص تعلق تھا۔ لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو مجھ کو زمانہ نہیں رہا۔ لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کڑھٹیں پوشیدہ ہیں۔ دوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے۔ جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اونہیں تو تھوڑی دیر کے لئے زائل نہیں کر سکتے۔

زندگی کے آخر عہد میں مرحوم کا توسل و ربار بھوپال سے ہو گیا تھا۔ اس تعلق کے پیدا کرنے میں سرسید اس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو بن مالی و قتل کا سامنا تھا۔ اب اس سے نجات ہو گئی تھی۔ آخر سر کی بیشتر مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھیں بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی سعاد ہے تو اسی ایک بینک کام کے صدائیں بھوپال کی نجات اُخروی قیمن ہیں۔ اقبال کو غم روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت رہے۔ چنانچہ اقبال کے بعض عقیدت مند سر اس مسعود مرحوم اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزل قوتوں پر فوق رکھتے ہیں۔ اگر انگریز قوم کے بارہ میں یہ بتایا جاتا رہے کہ وہ برطانوی سلطنت سے محروم ہونا پسند کرے گی لیکن شکسپیئر کو چھوڑنا گوارہ نہ کرے گی۔ تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی گراں سے گراں قیمت پر اقبال سے جدا ہونا پسند نہیں کریں گے۔

مرحوم کو سید اس مسعود مرحوم سے بڑی شیفٹگی تھی۔ اسی طرح سر اس کو بھی اقبال سے بڑا شغف تھا۔ لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی اور جس طویل پڑاؤ صاحب کی محبت



آرم کا موصوفہ خیال کھتی تھیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے  
مجبوراً میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا جو صبح آدھ گھنٹہ تک لکھنوی  
مسعود کو کلام پاک سناتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنوی موصوف کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہوئے الی  
تھی۔ مرحوم فرماتے تھے کہ کیا تم حل میں کسی خوش الحان قاری سے اگر ماں کا نام پاک سن لیا کرے تو بچے پر  
اس کا اثر بہت اچھا پڑے گا۔ ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے ارخانِ حجب زبیں  
درخشان ملت کو یوں مخاطب کیا ہے۔

زِ شام مابروں اور سحر را      بہ قرآن باز خواں اہل نظر سر را  
توسیدانی کہ سوزِ قرأت تو      وگر گوی تقدیرِ عمر را  
مرحوم کا طبعِ رحیم شمس پر ملا تھا کہ قاری صاحب کی تلاوت ہی مسعود کو کلام پاک سننے کیلئے فوراً آمادہ کرے مرحوم خود  
بھی دیکھتے رہتے کہ فیضِ لہو لعلِ قرآن ہے یا نہیں ایک دن کا واقعہ ہے کہ مرحوم نے رحیم بخش لکھا، از دی کہ قاری صاحب  
آتے ہوئے ہیں، لکھنوی مسعود کہاں ہیں۔ رحیم بخش نے کسی قدر آزدہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا،  
قرآن کیا سنیں گی۔ وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول لٹٹے چلی جاتی ہیں۔ وہاں سے فرشتے نہ تو آئیں  
میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا صبر رحیم بخش تعبیر، یہ کام بھی انسان ہی فرمادی ہے!  
اہل نظر جانتے ہیں اقبال کی نظر کہاں تھی۔ میرے نزدیک تو اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی  
ساجملہ ان کی فکرو فرزانگی و شہمی و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی آفاقی بصیرت کا پورے طہ پر  
ترجمان ہے۔ یہی ہنرمند ہے جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم  
سے آپ سے بڑے نہیں ملتے ہیں اور جہاں ان پر سنا جوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو  
درکنار ان کا قصہ بھی دشوار ہوتا ہے۔

جے موقع نہ ہو گا اگر یہاں ایک واقعہ مولینا محمد علی مرحوم کا بھی بیان کر دیا جائے تو مولینا محمد علی

خلافت کے سلسلہ میں یورپ جا رہے تھے۔ ایک الوداعی صحبت میں کسی صاحب نے مولانا سے سوال کیا، اور کیوں جناب راستہ میں دل بہلانے کی خاطر کوئی کتاب بھی ساتھ لے جا رہے ہیں، مولانا نے فرمایا کیوں نہیں، دوسرے صاحب نے پوچھا معاف فرمائیے گا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کس کس قسم کی اور کونسی کتابیں میں ہر مومن نے فرمایا دو کتابیں کافی ہیں اور وہی میں نے رکھ لی ہیں۔ صاحب نے ان کتابوں کا نام سننے کے لئے سراپا اشتیاق بن گئے۔ مزمع نے اپنے خاص انداز میں فرمایا ایک تو کلام پاک ہے اور دوسری دیوان (واجب) غائب

اسے محض ایک لطیفہ ہی کیوں سمجھا جاتے لیکن یہ بیان واقعہ ہر تہ بھی میرے نزدیک اس سے مولانا کی پرغیر شخصیت کی دلربائی کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ یہاں میں کسی طویل نفسیاتی مذاکرہ کو راہ دینا نہیں چاہتا۔ اصل مقصد وہ عظیم المرتبت شخصیتوں کی ذہنی پرواز پر وضاحت کی طرف سرفہ اشارہ کرنا ہے۔

میر کو صاحب نے لیڈی مسعود کی پہلی بچی کے غمخوار گی میں رفاقت پاجانے پر پنجوریاں کو تسکین و تشفی کا بڑا اچھا خط لکھا تھا اور آخر میں یہ شعر لکھا تھا۔  
 درحین بود و لیکن نتوان گفت کہ بود  
 اہ! ازال غنچہ کہ باو تر اور را نکشود

اس کے بعد نادرہ پیدا ہوئی تو جو اکثر اقبال بھوپال میں تھے اور لیڈی مسعود اندور میں۔ نادرہ کی ولادت سے اقبال بے انتہا مسرور تھے اور اُس کو دیکھنے کے بے حد مشتاق۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لیڈی مسعود اطلاع دے بغیر بھوپال آگئیں۔ اتفاق سے سراسر مسعود اور اقبال دونوں یکجا تھے۔ سراسر نے فرط اشتیاق سے آگے بڑھ کر بچی کو خوش میں لینا چاہا، اقبال نے آواز دی، نہیں پہلا حق شاعر کو پہنچتا ہے چنانچہ ماں نے نادرہ کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں دے دیا۔

مجھے اکثر خیال آتا ہے کیا نادرہ بڑی ہو کر کبھی اس پر بھی خود کرے گی یا نہیں کہ وہ نہ صرف بڑے باپ کی بیٹی ہے بلکہ جب وہ ماں کے پیٹ میں تھی اس کی قسیماتی پر پخت کا اہتمام اپنے زمانہ میں (اسلام کے سب سے بڑے اور برگزیدہ شاعر نے کیا تھا اور اس خوش ملازم سے سب سے پہلے براہ راست وہ اسی شاعر کے آغوش میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے جلاوید اور بالو کی تربیت و تہذیب و تمدن کے لئے ایک نثریہ جہن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی، بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی شخصیت سے رہ سہی تھیں۔ میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ عرصہ تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فخر مند تھے۔ ان کو معارف کی کمی بیشی پر مطلق ہرگز نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عبادت کی چھان میں ہیں اس درجہ کاوش کرتے تھے۔ کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطہ نظر میں پورے طور پر سمجھ چکا ہوں۔ مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ آپ امتحان انہیں دو ایک ہفتہ کے لئے اپنے ہاں بلا لیں۔ اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں۔ اس کے بعد فیصلہ کر لیں اس آسانی ہوگی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جہن خاتون جن کو بہاے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہا کرتے تھے لاہور پہنچ گئیں۔ ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خطوط آئے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی خدمت و فاطمیت و دیانت و امانت و محبت و حروت کا ذکر ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان و محبت ہو کہ ان کی رحلت کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں کو باورسار دے دیا کہ خاص طور پر ان کے سپرد کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات پر بہت سے لوگوں نے ان جہن خاتون کا بڑے اچھے الفاظ میں اپنے مضامین اور بیانات

میں تذکرہ کیا۔

مروم کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد میں لاہور گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے حامید اور بانو کو دیکھا۔ جاوید کسی قدر سیانہ تھا ایک حد تک خاموش اور کم آمیز۔ کل کر طے یا بات کر نہیں بھی تکلف کرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مروم کو جاوید کس درجہ عزیز تھا اور وہ اس کو کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ اور جاوید ان کے کلام میں کہاں کہاں اور کس کس طرح جاری و ساری تھا۔ لیکن میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ خود جاوید پر اس کا وہ اثر نہیں ہے جو ہونا چاہتے تھا لیکن بانو مشکل سے ۷۷ سال کی عمر ہو گئی۔ کبھی تندہست، پھنچل، ذہین، غرضبورت، بھولی بھالی بچی! ایسی لڑکی جو صرف ڈاکٹر اقبال کی لڑکی ہو سکتی تھی!!

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک رات، بانو حسب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، بانیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی۔ میں نے پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی بانیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپ جہاں اب موجود تھے کہ یہ چاند اور ستارے کتنے ہیکلدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے۔ اب یہ کیوں نہیں چمکتے۔

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مروم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے ہلتا اور بالو بھی مروم سے اس طرح پرواہ نہ ہو گئی تھی جیسے مروم اس کی ماں، اس کی بھولی اور اس کا مکھلنا سمجھی کچھ تھے۔ اسی سلسلہ میں خاتون کا بیان جو ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کر لی اور مروم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی۔ تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرہ میں بانو تک کا آتا بند کر دیا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں آگئی جہاں کوئی اور نہ تھا۔ میں پہنچ کر دیکھا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینہ پر بیٹھی ہوتی ہے تکلف بات کئے جا رہی ہے۔ میں گھبرا اٹھی، سر اقبال کی مبنیاتی تقریباً

زائل ہو چکی تھی۔ میں نے بے باتوں قریب جا کر بالو کو بہلا کر سدا کرنا چاہا۔ مگر اقبال بول بھی نہ سکتے تھے۔  
 بڑی ہی نجیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی تقریباً بند آنکھوں میں کچھ جھنجھش ہوئی جیسے وہ جاگتے  
 تھے کہ بالو کو ذرا دیر کے لئے جوں کا توں پہنا دیا جاتے۔ بالو کے اس طرح موجود ہونے سے عجیبان پر  
 ایک گونا گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بھٹی ہوئی قندیل کو وہ اپنی جذباتی امانت و مسرت  
 سے ایک لمحہ کے لئے اور اٹھا سے اور روشن کتے ہوئے رکھنا چاہتے تھے !

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سراقبال کا تذکرہ کرتی تھیں تو ان کے گریٹھو گریٹھو جوتاہئے۔ ان کا بیان  
 ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا۔ جب میں پہلے پہل بچہ تو کھانے پر ڈاکٹر صاحب  
 پورے کپڑے پہن کر آتے اور انہوں نے دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے  
 گھرانوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد تھا کہ انہوں نے بڑی معافی اور بڑے ہی لطف  
 سے بیخود ہنس ظاہر کی ان کا اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا جاتے۔ یہاں تک کہ وہ صرف باتن اور تھمد  
 پہنے کھانے پر چلے آتے جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھانے کو نہ رہی تھیں کھانا کھا لیتے۔ ان میں بھروسہ  
 کرنے کا عجیب مادہ تھا۔ میری کسی تجویز کو انہوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق توفیق نہیں  
 دیا۔ وہ اپنے عزیزوں سے زیادہ کمزور اور اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب  
 نے اکثر فرمایا کہ تمہارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں  
 بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز نے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کی پائیں باتیں سمیت اس  
 مرد قلندر کو آسودہ خاک پایا مجھے یقین نہ آیا کہ اس اقبال کی آرا نگاہ ہے۔

سکھائی و شرتوں کو آدم کی تڑپ جس نے

اور اہم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی چڑا سر اور چڑو قمار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور عدایات و مہر و دماغ پر اس درجہ اور اتنا جملہ مستولی پہنچاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور مرنہ چاہئے تھا۔ جہاں اقبال کے تقویر میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔ اقبال زندہ تھے تو اعلیٰ نمان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر ان سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی۔ ہجرتی ذہن کی استعداد کو شکستہ کرے گی اور دل کے دلولوں کو بڑھائے گی۔ ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انہیں سلجھا دیں گے۔ کبھی محنت و محالہ سے پچنے کے لئے دل کو سلایا نہ تا کہ دماغ پاشی کیوں کی جاتے، کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اعلیٰ نمان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ وہ تمام ذہنی تقویٰات جن میں بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تغیر کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا، اقبال کے اٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہو گئے۔ اب نہ وہ دلولہ رہا کہ ان کا پھر سے یقین کیا جاتے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رفیق و مدبر ملے گا جو ان کی تشکیل و تربیت میں مدد دے گا۔

اقبال کا ایک خاص وصف یہ بھی تھا کہ وہ اکثر ایسی باتیں بتا دیتے تھے اور اس طرح سے بتا دیتے کہ اس ایک بات سے بے شمار نئی نئی اور عجیب باتیں ان خود برآمد ہونے لگتی تھیں اور کم و کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں ان کی اس ایک بات سے بہت سی دوسری باتیں نکال سکتا تھا۔ پھر طے یہ کہ یہ دوسری باتیں اصل بات سے کوئی واسطہ براہ راست نہیں رکھتی تھیں ان کی بتائی ہوئی باتیں نہ صرف نئے راستے کھول دیتی تھیں بلکہ ان راستوں پر مجب ہوا نہ محبت نہ اندازہ سے گرم رفتار ہونا بھی آسان اور دل چسپ ہو جاتا تھا۔

اقبال دوسروں کے نزدیک کیسے ہی کچھ دھول میرے لئے تو وہ بہت کچھ تھے۔ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ بہت سے مقامات پر وہ خود اپنے آپ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اگر یہ شاعری ہئے تو ہمیری کیا ہے؟ اور یہ غمیری ہئے تو شاعری کا کیا درجہ ہئے؟

---

# احسن مابہروی مرہوم

عشق کوئی ہمدرد کہیں ملت میں پیدا کرتا ہے  
 کوہ رہیں گونا لال برسوں لیکن اب فرماؤ میرا (میرا)

مولانا سید علی احسن صاحب احسن مابہروی مرہوم کے ساتھ شعبہ تادو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرہوم کی صمدی غزلیاں ہم سب کے سامنے آئیں۔ شعبہ کو ان سے بڑی تقویٰ تھی اور سلمونیوریٹی کے اندر مابہروں کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کی بزرگی کا قدر و زودیک شہرہ تھا۔ اُسودال طبقہ میں وہ بڑی ترقی کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔ مولانا قدیم مسدک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی محنت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کی



ان کو لازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیش روؤں سے ان تک پہنچی تھی۔ بایں ہر وہ اردو ادیب شاعری کے جدید اسالیب اور جدید قیودات سے نہ بیکار نہ تھے۔ نہ مہزار۔ اس نئے لوہستان کے نقطہ نظر کو لوہرے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر دیتے تھے خواہ شاعر کا مسنگ ان کے مسدک سے بالکل جدا تھا نہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مروج و مقبول ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے۔ اور راجد تل تل ہو جاتے وہاں دلوں میں فدا تامل نہ کرتے۔ اردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا مولانا اس میں بڑے شوق و انساک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات و قیودات کے انہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے۔ دوسرے کے نقطہ نظر کو توہ اور مبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے۔ اس اعتبار سے ان کو ترقی پذیر، اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پسند برابری ترقی پسند کا مفہم آخر یہی تو ہے کہ جرات کے ساتھ اپنی کلمے اور مبر کے ساتھ دوسرے کی سنئے۔

رحلت کے وقت مرحوم کا سن چھیانوے کے الگ بیگ رہا ہوگا۔ جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوش دلی اور ذواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منتقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا۔ مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محمل استعمال پر اختلاف آتا تھا۔ فوراً اس کی ٹوہ میں لگ جاتے۔ اکثر محسوس ہوتا جیسے کھوے کھوتے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ مطلب باری نہ ہوتی تو ہر کسی لحاظ و تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کسی کئی دن اسی ادھیڑ میں ہیں۔ بالآخر بات واضح ہو گئی تو خوش خوش اس حلق کی صحبت میں بیٹھے والوں کو ڈروا فروا تحقیقات

کے نتائج بتاتے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جبران کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سعی و سبب آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی رہے۔ میں نے یہ بات جرمن پروفیسر کونگولم میں بھی پائی جو کچھ دونوں کے ملنے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کونگولم نے عالم متبحر ہونے میں کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کر کے بتائیں گے۔ جب بات منقطع ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بناتے۔

پروفیسر کونگولم اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ ہڈ حصے میں لکھ بات کرنے کے شائق۔ متوسط جسم، لمبا قد، عینک لگاتے ہوتے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کافی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے ضرور لائبریری پہنچتے ہیں۔ پروفیسر کونگولم کو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور تگڑے کرتے اور ہر شخص کو فروزا فروزا مخاطب رکھتے ہوتے پاتا۔ گفتگو کے دوران میں کوئی آجانا تو اس سے مخاطب کر کے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی۔ اس کا خلاصہ دے کر کہہ دیتے بڑھتے مجھے یاد رہے ایک بار (*Model de Luxe*) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کونگولم نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فروزا فروزا ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ آدمیوں سے کم نہ تھی!!

باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تراجم مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے۔ سند میں اساتذہ کے شعر فی الفوہ

پڑھتے۔ کتھے تھے استاد و اسے مرموم کے آخری دور میں ان کے معلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر تالیف یا عمل استعمال کے بار میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں۔ استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے۔ اس سے مانع مرموم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور عمل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جبرائیل استفسار است باہر سے شعبہ اردو میں آئے ان پر مرموم کا محاکمہ بڑے محرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفظی کو دل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرنے والے بعد میں سمجھتے کہ مولانا مرموم کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرموم کے پاس اردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق و محنت سے جمع کرائے۔ کتھے تھے دو چوریاں جاتنہیں۔ ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولانا کی خدمت میں ہم سب بہت سب سے تکلف انداز شروع تھے۔ مرموم بھی ترکی۔ ترکی تو اب آئینے میں تامل نہ کرتے۔ مولانا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے، ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرموم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے فکرتے تھے جیسے بوڑھے خزان کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ نوجوان اور بچوں میں ایسے علم ہوتے جیسے ان میں ان سے زیادہ دل چسپ کوئی اور نہیں۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی کیے سن لوں۔ ساری عمر اسی میں گزار دی۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر پھینک دیا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب غور کرتے لیکن وہ اس بارہ میں کہیں تکلف یا تاثر سے کام نہ لیتے۔ ایک دن شعبہ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورڈاس پیو میں ریلوے میں ملازم تھے۔ مسودات کا بہت سا ذخیرہ تھا۔ اردو مشعر کا ایک مسبوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غزب نے ملازمت کے کس حکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی

کا اٹھا رکھا اور ان کی محنت کی واحدی۔ اسی اثنا میں مہر م تشریف لاتے۔ فوراً رو سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولانا کی تعظیم و خوافی شروع کی۔ ہم سب سنبھلی ہاں میں ہاں ملائی اور مولانا پر بابت و طائنا شروع کیا کہ مستودہ کی طرف مائل ہوں۔

مولانا نے طلقاً التفات نہ کیا اس سے نہ تو نو طائندگی دل جمعی ہوئی اور نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کا اصرار تھا کہ مولانا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہم دی۔ مولانا نے کسی قدر اگتا کہ مستودہ کو بالکل یونی ایک عکس سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اڑدوہٹے اور یہ کیا خرافات لکھ رہا ہے۔ جاتو اسے ٹھیک کر دو۔ یہ کہہ کر مستودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف محال طلب ہو گئے۔ مہنی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولانا نے بغیر ان کی طرف رخ نہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی، حقوڑی ویر بعد بڑے مایوس لہجے میں عرض کیا۔ دس برس بعد تو بڑی ہوئی۔ مولانا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال ٹاک گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا۔ کاتا اور لے دوڑے۔

مولانا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہو گئے۔ میں نے عرض کیا مولانا یہ بھی معلوم ہے کہ یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ بیویوں میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو میں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے محنت سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہیں تو چاہتے مفت میں پکڑ دیں!

مولانا بے ساختہ ہنس پڑے اور نو طائند سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی شیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولانا کے دل میں نہ کیلئے نہ مسکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں۔

اس سے میں نے بہت نقصان اٹھاتے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مادہ ہے کہ دل میں باتیں رکھ پاتا۔

ایک بار ایک دوست نے مولانا کو اپنا انتہائی راز دل سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا تھوڑا ہی عرصہ بعد مولانا میرے پاس آئے۔ عجیب جیسے میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے بلایا نصیبی سے مولانا کے دل میں جا گوس ہو گیا ہے اور بقول غالب سیدہ سہل سے پرانشان نکلتا چاہتا ہے۔ میں نے خود دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولانا سنیان مٹتی مٹتی کہتے تھے اور صبر انہیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی محنت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انہوں نے بے اختیار دھوکہ پر بھاری بھر کم جسم کو اس طرح تو لایا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور تھکان میں آکر پچھوٹکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ ادھر ادھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کرنی اور کچھ کھانا۔ میں ان کے ارادہ سے واقف ہو گیا۔ میں نے بھی ایک لباس اس لئے کراہی کرسی من سے اتنی ہی دُور کر لی جتنی انہوں نے قریب کی تھی۔ مولانا کچھ ایسے ہنسی منہ نشا میں مبتلا تھے کہ انہوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا۔ اور نفس مضمون پر اسے کی مدد و بردار دے دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولانا اس دفعہ پانچوں گے۔ چنانچہ میں نے دو کھانہ کی بجائے راہِ روا اختیار کی اور ڈھک کر کھا گا۔ مولانا بآں جب پھر میری رائے غائب بھی نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مجھے ہی بیٹھے فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھانسنے کی سائنس و آرٹ یعنی (REAR GUARD ACTION) ریر گارڈ اکشن (دوبل پسپائی) سے پوری طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے جوابے یا جی ہاں

اے اس سلسلہ میں غالب مرحوم کا ایک شعر آپ کو یاد ہو گا  
اہل ہوس کی فتح ہے ترکِ بند و عشق      خوابوں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوتے

مولانا میں بھی آتا ہوں۔ مولانا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے۔ میں دروادہ سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولانا نے جان پھیل کر آخری گولی چلا دی۔ میں گبر گیا۔ مولانا نے راز فاش کر دیا تھا !  
 مولانا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ مشرعیوں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے ماہرہ تشریف لاتے اور اس خاندان کی باقی ہوئے چنانچہ مرحوم کی خاندانی عظمت و وقار کا چھوٹا بڑا معترف رہے علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دینا اور اگر تعلق رہا ہے اور خاندان و خاندانہ برکات کا نام دُرُود و رُتک شہسور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں دیتے تھے۔ ہر طے والے سے برسی توفیق اور محبت سے ملتے تھے وہ بہت جلدیہ تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن مسکاتی اور بے قیڑی کے کبھی روادا نہ ہوتے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھپے ٹھے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اذنی ہو تا۔ مولانا کی بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طور پر وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا گھلوں تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی میٹھا ہوتا۔ تو بچہ نہایت احترام سے جھک کر ادب بجالانے اور بوجھ ہونا ہوتا مولانا کے قریب جا کر اہمیت کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد زامین لطف و شفقت سے ان کی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا خاص کر نے کو باپ بچے کی آواز کو بہت اہمیت دے رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے کرتے یا جامے، سر پر بال باریک ترشے ہوتے۔ پاؤں میں جوتا۔ سر پر ٹوپی۔ چلنے پھرنے میں بولنے میں ایک طرح کی شستگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے، ننگے سر پھرنے

یا انواع اقسام کے نکل اور متعین پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آئندہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔  
مرلانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور تھے۔ بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ بعل اوزیت تھی۔  
قل اوزیت کا میں بھی قاتل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدین کے مفت بلایں قل اوزیت کو گردن دینی  
بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف خوردوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بھاؤ کرنا پسند کروں گا۔  
البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا  
ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ ہاں تک وضع قطع، رہن سہن، مرنے بیچنے، نفع یا ہانی  
و نفع رسائی کا تعلق ہے پڑنے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں۔ نہ ان کو ملزم قرار  
دیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی دنیا زمانہ مجموعہ صد کریمات سمی  
لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت  
نہیں دریافت کا اثر تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ باہمی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔  
مروجہ پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چولیس سب پرانی ہی تھیں۔  
لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور زیادہ نفع رساں تھے جن کے پاس  
جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے، مروجہ سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے۔  
وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کس محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے۔ ہر گیارہ ان کی پذیرائی خوشدلی  
سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر  
طرح سے مدد کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہر گئے تھے اور تقریباً صدی آبادی ملکیت ہاتھ سے نکل  
چکی تھی۔ تنگ مالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں، عزیزوں اور حاجت مندوں

کی سبھی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیسی کر گزرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے۔ وہ جس طرح دوسروں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے۔ اس پر ہم سب بھی ان پر فقرے بھی چسٹا کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع پر ایک ہاؤز فرمایا۔ بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جب کہ میرے پاس کچھ نہیں رہے تو اپنے بسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں نہاں اسے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو مستر میں کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستان کے پیرو تھے۔ ساری علم و شعر و شاعری، تصنیف و تالیف، تحقیق و تدریس میں گزاری۔ اپنے استاد کے تسلیم و تثبیت پر تھے۔ لیکن کلام میں سنا و سبھی چھوٹی سمیٹی سا گنتی شری و قلین و دبیرت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا۔ لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان محلوہ و مصطلحات متعلقات شاعری کے سمجھنے پر کھنے اور بہتے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد بلد اٹھتے جا رہے ہیں۔ صحت زبان و مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس پر تے پر کرے شاعر جمیں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہیں۔ فنی تجربہ جی اہم چیز ہے شاعری زبان و بیان ہی کے مترادف میں جاوے جاتی ہے۔ اس لئے زبان و بیان کے بقدر معیار کو ہم بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور نند و گو شاعر میری نظر سے کم گزر رہا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوتے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوتے جو اعلیٰ حضرت خسر و کن کے خود سال بھر گوشہ کی خوشی و متوقع سائنہ فطرت پر ہوش بلکہ ای نے لکھے تھے اور جن میں بعض فقرات نثری بھی شامل تھے مولانا آج مرحوم نے ان مضامین کو قلمبندی کے لئے شریعہ کی جگہ پر لکھا کہ شہید



میں بیٹھے جیسے اس طرح کے طلباء اور فقہائے کرام نے گفتگو بھی جاری ہے علمی بحثوں میں حصہ لے رہے ہیں۔  
ہمسنی مذاق میں بھی شریک ہیں۔ اور شبنوی بھی لکھی جا رہی ہے۔ مشکل سے تین چار دن گزرے ہوں گے۔  
کہ شبنوی مکمل ہو گئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب  
اصل معنایں جن سے یہ شبنوی موسوم بہ شاہر کا عثمانی (الفاظ و معنی مافرد ہے پیش نظر ہوں)۔

ایک دن شعرو شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے سبیل تذکرہ  
فرمایا کہ اصغر گوٹروی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا۔  
جب مصرعہ طرح دے دیا جاتے اور ان سے کہا جاتے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ بولا مرحوم  
یہ سن کر آپ سے باہر ہو گئے۔ آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آجاتے تھے تو ان  
کا لب و لہجہ نہایت درجہ دل چسپ ہو جاتا تھا۔ بلبل کا وحشی آستین کا کرتا پھرنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے  
تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستین پر ٹھالی اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں جوش میں آؤ۔ یہ  
کیا بات گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر کو تھارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے۔ جس کو عشق  
شاعر سمجھتے ہو اس سفرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم  
دونوں کے سر پر ٹپیں تار پڑاؤ تو جوتے اس وقت مصرعہ طرح دو۔ پھر دیکھیں کون کتنے پانی میں ہے۔  
مولانا کی برہمی کا یہ نظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دیکھے پڑے تو میں نے عرض کیا  
ولا نا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں مگر تجوزہ ادواب آئندہ سے نافذ کر  
دئے جائیں تو کیا ہو۔ مرحوم تہنید مار کر کرسی پر لیٹ گئے۔ کہنے لگے، بڑا اچھا ہو۔ کم بخت  
گوٹیوں سے نجات ہو جاتے۔

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں فصل میں کس کس قسم کے دروش و طہور کمال  
کمال سے کھینچ کر آتے ہیں اور عید و میتاد، دانہ دم، تنہا و تاشا کی کیسی کیسی نیونگیوں سے

سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ سامنے کی صف اول میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میر کے بچپن میں یکہ بالوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک معرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ع

کماں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں مغت مشکل ہے

مولانا کی باری آتی بھلے مانسوں کے سیدھے سامھے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی

۷ سازندوں کے اندازِ مکمل سے لاولں بختی ہوتی آواز کماں سے لاولں ✓

فرماتیں محافِ نوبرانِ سخن بولے جہاں نیا ساز کماں سے لاولں

ٹھننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہنسنے لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد طرح میں غول پڑھنی شروع کی۔ جس کے اس شعر پر صفت اول کو مد نظر رکھ کر پڑھا گیا مجمع سے وہ نعرہ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز نہیں مٹتی دیتی تھی ۷

بٹنی ہے ایروں میں ترجمان کی دولت یہ صرف خیرت سمجھ میں نہیں آتا

مجموعہ کو مشاعرہ مستعد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انماک سے اس کا اہتمام

کرتے تھے اور شعرا و مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے ہاں کوئی تفریب

منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چھل چھل کے گزرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظ

مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس ممبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا۔

چنانچہ رخصت لے کر ممبئی گئے۔ وہاں اجباب اور قدردانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے

زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں

پر وراثت پر اسلئے ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس

دستِ ہر بات پر یا تو نہایت درجہ ہنس دیتا تھا تو فحش ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم صافری پر سخت برہم ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعیرہ اردو کی بھی خیر نہیں میری طلبی ہوتی، مرکا لہٹنے۔

صاحبِ لال جھجھو کا ہو کہ اور صبح گری میری طرف رخ کر کے (یہ کیا مغریت ہے؟  
میں) متعجب و مرعوب ہو کر غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب؟  
صاحب (تقریباً دانت نہیں کر) بے شک مولانا صاحب نے کیوں دیر استہدیٰ، ان کو کیا حق تھا اپنے فرائض سے انہوں نے غفلت برتی!!

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ لیکن قیاس یہ ہے کہ کتنی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہتے۔

صاحب (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کتنا ہوں وہ آغوش گئے کیوں؟

میں۔ شعر پڑھنے!

صاحب۔ شعر!

میں۔ شعر، جناب والا!

صاحب۔ اپنے شعر؟

میں۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا؟

میں۔ ہوتا ہوا نا کچھ نہیں عالی جاہ، لیکن ماننا کوئی نہیں۔

صاحب۔ تم شعیرہ کے انچارج ہو۔ اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں۔ جناب والا میں نالائق تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا ممکن نہیں کہ مولانا شریف لائق تو  
 جناب اُن سے بھی گفتگو فرمائیں۔ بہت سی باتیں واضح ہو جائیں گی۔  
 صاحب۔ بہت خوب، مولانا صاحب کو میرے ہاں لانا (کسی قدر غرضد فرما کر)  
 مجھے اب تک اُن سے ملنے کی سرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

پرو وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی میں اور مولانا حاضر ہوئے۔ مولانا  
 کو دیکھ کر صاحب یک لحظہ جھکے اور فوراً ہی مروتہ ہو کر مولانا کو تسلیم دی۔ انتہائی گرم ہوشی کا  
 اظہار کیا۔ مزاج پُرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بھیچہ بھیچے گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرسنل حال  
 نہ تھا۔ البتہ یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورٹس بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب  
 کی طرف سے۔ یہاں تک کہ دیکھتا ہوں کہ دونوں سو قد کھڑے ہو گئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب دعائی  
 سائنہ ہو گا لیکن مصافحہ پر یہ محبت ختم ہو گئی۔

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شونمیاں بھی کرتے تھے۔ مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز  
 کا تھا۔ وہ ہر تین معلم بن کر پڑھاتے تھے۔ اور طالب علموں سے اُن آداب کی توقع رکھتے تھے جو  
 خود مرحوم نے اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں تک  
 دل دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزر و دبہاں سمجھے آ رہے ہیں۔ معذرتی ویر میں طلبا بھی آ گئے۔  
 معلوم ہوا کہ بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے تھے۔ مولانا کو یہ بات بہت  
 ناگوار رہی اور کلاس سے چلے آتے۔ معاملہ رُفت گزشت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسی مسئلہ پر مولانا سے  
 گفتگو ہوئی۔ فرمایا: رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ رُفت گزرا ہی اور تفریح و گفتگو کیلئے

آئے ہیں۔ یہ دنیا میں جڑیا ہیں کہ لیں علم نوزان کو آئے کا نہیں! میں نے عرض کیا مولانا، آپ کا فرنا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبا کا تصور نہیں ہے۔ دنیا کا ایسی رنگ بنے جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قد و قیمت رکھتی تھیں۔ وہ اب مروج ہرچی ہیں۔ جعفر مراد تب آٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احسانا نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کوئی حصے نہیں۔ لوگوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو معلوم نہیں وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کے شکار ہیں۔ مروج کو امین مل نہیں ہوا، بولے جی نہیں میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجئے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں۔ آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجئے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انہیں کڑے ہیں۔ مولانا میٹھے پڑ گئے اور کسی قدم پر ہم سروں میں انا اللہ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چاہئے ہے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ پھر شکر کھانے کا بسا تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے۔ اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں چھینسیوں سے لہ جاتے تھے۔ لیکن ہم ہر شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے ذیابیطس کے پیمانے مریض تھے۔ لیکن اس کی بالکل پروا نہ کرتے تھے۔ اس وضع داری نے کاربیکل سے دو چار کیا اور کاربیکل نے انہیں ان کے پیدل کرنے والے سے جا ملایا۔

مروج مقررہ میعاد پر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوتے تھے لیکن اس سن و سال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے۔ جوائن سے بہت کم سرواڑوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے قوائے ذہنی و جسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے۔ شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ مدلی میں رند، پارساؤں میں پارسا، عڑوں میں عڑو، بزرگوں میں بزرگ، کیسے کیسے زمانے،

کیسی کہیسی مجلس اور مجلس دیکھے اور برتنے ہوتے۔ یہ ہر ہجرت شخصیت بالا آخر ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء کو  
جمہور کے دل افروز رحمت میں پہنچ گئی۔

اگست ۱۹۴۷ء کا غالباً پہلا ہفتہ تھا اسکان سیدنیو سٹی آ رہا تھا کہ خبر ملی مولانا حسن  
کار میل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہنچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا مرحوم دیکھنے  
میں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام و پیام بھی نہیں پڑا تھا کہ بے اختیار ہر کمرہ پر لے اور  
کیوں حضور سنا ہوں تختہ دال شائع ہو گئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے ہر ایک سے پوچھتا ہوں  
کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدا را حقوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔  
کہاں مرض الموت کا یہ کرب۔ کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب۔ اللہ اکبر! میں بہرمت  
ہو گیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان وزمین کی ساری پہنائیوں پر مرض  
کی شخصیت سنبھلی ہو گئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹپس  
سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدا را کتاب بھیج دیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا  
ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں! عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا  
کو مل سکی +

————— ❦ —————

(میاں محمد حنیف پبلشر نے دین محمدی پریس لٹری میں باہتمام ملک محمد عارف خاں پشاور پبلشرز کو اردو کمیٹی کے نام سے پیش کیا)









